Rs. 50/-

ملت کا ترجمان

ماہنامہ

جام نور

دہلی

June 2011

پاکستان کے معروف محقق اور عالم دین
محترم مولانا **سید شاہ حسین گردیزی**
سے ملاقات

مولانا عبدالحق خیرآبادی اوران کے تلامذہ کے علمی معرکے

عصر حاضر میں مسلم نمائندہ نسل کی تعمیر کیسے ہو؟

اور جب ''برج شاہی'' بولے گا

امریکہ نامہ

''مشرق ومغرب میں اخلاقیات، روحانیت اور دانش وری کی روایت'' کے موضوع پر امریکہ میں ایک بین الاقوامی سیمنار میں شرکت اور امریکی زندگی کے سماجی، اقتصادی اور مشینی پہلوؤں کی عینی شہادت کی روداد

بفیض کرم
فیض العارفین حضرت علامہ
شاہ غلام آسی پیا

بانی
قائد اہل سنت
رئیس القلم حضرت علامہ
ارشد القادری
علیہ الرحمۃ والرضوان

ملت کا ترجمان

ماہنامہ جام نور دہلی

نواں دور

۱۰۳/واں جام

جون ۲۰۱۱
جمادی الاخریٰ/رجب المرجب ۱۴۳۲ھ

بانگ درا

احسان نام ہے اسلام وایمان کے غایت کمال کا۔ اس لیے اگر کوئی مسلم اور مومن نہ ہو تو وہ صوفی ہو ہی نہیں سکتا بلکہ مومن کا متقی ہونا احسان تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ فقیہ نام ہے محافظ قوانین اسلامی کا، وہ ظاہر کا نگراں اور عاقل ناقل ہوتا ہے اور متکلم وہ ہے جو افعال قلبیہ سے بحث کرتا ہے یعنی وہ عاقل باحث ہوتا ہے اور رہا صوفی تو وہ عاقل وباحث ہونے کے ساتھ شاہد بھی ہوتا ہے۔ فقیہ نقل سے نتیجہ اخذ کرتا ہے، متکلم بحث کے بعد نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور صوفی مشاہدہ کے بعد کلام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقیہ کا درجہ عام اہل علم سے اعلیٰ ہے اور متکلم کا مرتبہ فقیہ سے بڑھ کر ہے جب کہ صوفی ان دونوں سے افضل واعلیٰ ہوتا ہے بلکہ اسلامی علوم وفنون کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والا مثلاً محدث، فقیہ، متکلم، مفسر وغیرہم کوئی بھی صوفی کے ہم سر وبرابر نہیں ہوسکتا۔

شیخ ابوسعید احسان اللہ صفوی

ص: ۴۳، مجلۂ الاحسان-۲، خانقاہ عارفیہ الہ آباد

مدیر اعلیٰ	خوشتر نورانی
مدیر	ذیشان احمد مصباحی
سب ایڈیٹر	نورین علی حق
سرکولیشن منیجر	عنایت حسین
اشتہار منیجر	غلام قادر فیضی
تزئین کار	کوثر حسنانی
کمپوزنگ	جام نور کمپیوٹرز
آپریٹر	شمس الدین مصباحی
کاتب	عبدالمجید فیضی

فی شمارہ :	15/=
زر سالانہ :	170/=
قیمت پاکستان میں	50/=
بیرون ملک (ہوائی ڈاک)	30 $ امریکی ڈالر
	20 £ پونڈ
لائف ممبر شپ (اندرون ملک)	5000/=
لائف ممبر شپ (بیرون ملک)	300 $ امریکی ڈالر

مراسلت وترسیل زر کا پتہ

ملت کا ترجمان جام نور
۴۲۲ مٹیا محل، جامع مسجد دہلی

MILLAT KA TARJAMAN
JAAM-E-NOOR (Monthly)
422, Matia Mahal,
Jama Masjid, Delhi-110 006
Ph.: 011-29945883, 9717220944
E-mail : jnoormonthly@yahoo.com
k_noorani@yahoo.com
Website
www.newagemediacentre.com

نوٹ: آپ کو ملنے والے رسالے کے لفافے پر (پتے کے اوپر) اس شکل میں 3040/Jan-06-Dec.07 آپ کی ممبری فیس کی مدت لکھی ہوئی ہے، براہ کرم رسالہ پڑھنے سے قبل اسے دیکھ لیں، اگر آپ کی ممبری فیس ختم ہوگئی ہو تو اولین فرصت میں تجدید کرالیں، ورنہ ہم آپ کو رسالہ بھیجنے سے معذور ہوں گے۔ ادارہ

ڈرافٹ اس نام سے بنوائیں
MILLAT KA TARJAMAN JAAM-E-NOOR

پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر غلام ربانی نے اسٹار آفسیٹ 2229/A احاطہ حجن بی، سوداگران، لال کنواں، دہلی ۶ سے طبع کراکر آفس "ماہنامہ ملت کا ترجمان جام نور" ۴۲۲ مٹیا محل جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حافظ بخاری سید شاہ عبد الصمد مودودی چشتی

ولادت: ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء- وفات: ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۵ء

کی علمی اور دینی خدمات کے نام

- جو برصغیر ہندو پاک میں تنہا ''حفظ بخاری'' کے شرف سے ممتاز ہوئے۔
- تیرہویں صدی کے آخر اور چودہویں صدی کی ابتدا میں جنہوں نے فکری انحراف اور اعتقادی آزادروی کے مقابلے میں تحریر و تقریر کے ذریعے قائدانہ کردار ادا کیا۔
- جنہیں ۱۳۱۳ھ میں تحریک ندوۃ العلما کے رد میں قائم کی جانے والی تنظیم ''مجلس علمائے اہل سنت'' کا باتفاق رائے صدر نامزد کیا گیا۔
- جنہوں نے فتنہ امکان نظیر کے رد میں مجاہدانہ کردار ادا کرتے ہوئے اس فتنے سے اسلامیان ہند کے عقیدوں کی حفاظت کی۔
- جن کی تصانیف نے باطل کے اندھیروں میں ہدایت وارشاد کا چراغ روشن کیا۔

ادارہ جام نور

حافظ بخاری ایک نظر میں

نام: سید عبد الصمد چشتی مودودی۔

لقب: حافظ بخاری، قبلۂ عالم، خواجۂ بیکس نواز۔

نسب مبارک: حضرت خواجہ ابو یوسف قطب الدین مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد و امجاد سے حسینی مودودی سید ہیں۔

والد گرامی: حضرت سید غالب حسین مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، جن کو ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے بغاوت کے الزام میں شہید کر دیا۔

ولادت: ۱۴ر شعبان ۱۲۶۹ھ-۱۸۵۳ء۔

مقام ولادت: قصبہ سہسوان ضلع بدایوں۔

حفظ قرآن مجید: ۱۲۷۶ھ میں صرف سات سال کی عمر میں قرآن مجید کے حفظ سے فراغت پائی۔

ابتدائی تعلیم: سہسوان ضلع بدایوں میں، اپنے خالہ زاد بھائی مولانا حکیم سخاوت حسین صاحب سے حاصل کی۔

اعلیٰ تعلیم اور فراغت: مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف۔

اساتذہ: سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی، تاج الفحول مولانا شاہ عبد القادر محب رسول قادری بدایونی۔

بیعت طریقت: ۱۲۶۴ھ میں گیارہ سال کی عمر میں خیر آباد شریف میں شیخ المشائخ حافظ سید محمد اسلم چشتی خیر آبادی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔

مشرب: چشتی، نظامی، فخری، سلیمانی۔

اجازت وخلافت: شیخ المشائخ حافظ سید محمد اسلم چشتی خیر آبادی سے تمام سلاسل میں مجاز بیعت تھے، لیکن رنگ چشتیہ کا غالب تھا۔

اجازت حدیث: ۱۲۸۴ھ میں محدث مدینہ منورہ شیخ یوسف بن مبارک بن حمدون یمنی المدنی سے اجازت حدیث حاصل کی۔

مناظرہ: مسئلہ امکان کذب اور امتناع نظیر کے موضوع پر ۱۷ر سال کی عمر میں مشہور غیر مقلد عالم میاں امیر حسن سہسوانی سے سہسوان میں مناظرہ کیا، جس میں فتحیاب ہوئے۔ پھر ۱۲۸۹ھ میں مولانا امیر احمد سہسوانی سے اثر ابن عباس کے موضوع پر مناظرہ ہوا، جس میں مولانا امیر احمد سہسوانی کو لاجواب کر دیا۔

صدارت مجلس علمائے اہل سنت: شوال ۱۳۱۳ھ میں آپ کو باتفاق رائے ''صدر مجلس علمائے اہل سنت'' منتخب کیا گیا، اس مجلس میں تاج الفحول مولانا عبد القادر بدایونی، امام احمد رضا فاضل بریلوی اور محدث سورتی جیسے اعاظم علما شامل تھے۔

تصانیف: آپ کی بعض اہم تصانیف یہ ہیں: (۱) افادات صمدیہ رد شکوک وہابیہ نجدیہ (۲) الطوارق الصمدیہ (۳) حق الیقین فی مبحث مولد اعلیٰ النبیین (۴) نصر المسلمین علیٰ عداۃ سید المرسلین (۵) نصر السنیین (۶) ارغام الشیاطین (۷) تبعید الشیاطین بامداد جنود الحق المبین (۸) جمع تلبیسات صواعق وغیرہ یہ تمام کتابیں کسی نہ کسی گمراہ فرقے کے رد اور اہل سنت وجماعت کے دفاع میں ہیں۔

پھپھوند شریف ہجرت: ۱۲۹۳ھ میں سہسوان ضلع بدایوں سے ہجرت کر کے قصبہ پھپھوند ضلع اٹاوہ (اب اوریا) میں سکونت اختیار کی۔

وصال: ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں ۱۷ر جمادی الاخریٰ اور ۱۸ر جمادی الاخریٰ کی درمیانی شب میں وصال فرمایا۔

صاحبزادہ وجانشین: حضرت سید شاہ مصباح الحسن چشتی مودودی (ولادت: ۱۳۰۴ھ-وفات: ۱۳۸۴ھ) آپ کے فرزند گرامی تھے، جو آپ کے بعد آپ کے جانشین ہوئے۔

کرنے کے کام!

اس ماہ کے اداریے میں مجھے آپ سے صرف تین باتیں عرض کرنی ہیں، یہ تینوں باتیں آپ کی توجہ کی طلب گار ہیں:

(۱) پچھلے دو تین برسوں سے یہ بات تقریباً تسلیم کرلی گئی ہے کہ دین ومسلک کے حوالے سے ماضی کے مقابلے میں اہل سنت میں عمومی بیداری آئی ہے- اہل علم ودانش خصوصاً نوجوان نسل میں کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا ہے اور وہ کام کے نئے آفاق کی تلاش میں سرگرداں ہیں- یہ بات ہمیں بھی تسلیم ہے، اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں بنتی- غالباً ۲۰۰۴ء کی بات ہے، میں نے اہل سنت کے جمود وتعطل کے حوالے سے ایک تفصیلی تحریر قلم بند کی تھی، جس پر ہمارے دیرینہ دوست مولانا اسید الحق قادری نے جامعہ ازہر مصر سے خط لکھ کر میرے موقف سے قدرے اختلاف کیا تھا اور فرمایا تھا کہ احساس زیاں اور خود احتسابی اچھی چیز ہے، مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے کیوں کہ اب ہماری جماعت بیدار ہو کر نئے سرے سے صف بندی کررہی ہے- موصوف کے مراسلے کے جواب میں میں نے عرض کیا تھا کہ جس معاشرے میں درجنوں مکاتب فکر اپنے عقائد ونظریات کی اشاعت کے لیے نت نئے انداز سے مصروف کار ہوں وہاں اپنی ارتقا سے زیادہ ''رفتار ارتقا'' پر نظر رکھنی ضروری ہے- میں آج بھی اپنے اس موقف پر قائم ہوں اور اپنی بیداری کا جشن منانے سے زیادہ اس بات کی فکر رکھتا ہوں کہ مسلکی مقابلے کی اس دوڑ میں ہم کہاں تک پہنچ سکے ہیں، کیونکہ یہی فکر، جہت کا تعین، عملی اقدام اور تیز رفتاری کا مطالبہ کرتی ہے- اس لیے ہمیں اپنی اس بیداری پر خوش ہونے سے زیادہ ترجیحی طور پر اس بات کی طلب ہونی چاہیے کہ دین و مسلک کے اس ارتقائی سفر میں ہماری حصہ داری کتنی ہو سکتی ہے اور وہ کون سا خلا ہے جسے ہم اپنی صلاحیتوں سے پر کرسکتے ہیں-

اس سلسلے میں اکثر دو باتیں دیکھی گئی ہیں، ایک کا تعلق تساہلی سے ہے جبکہ دوسرے کا تعلق بے سمتی اور جذباتیت سے- ہم میں سے بے شمار افراد ایسے ہیں جو دینی ومسلکی خدمت کے جذبے سے مدرسے چلا رہے ہیں، کوئی امامت وخطابت کا فریضہ انجام دے رہا ہے، کوئی تحریر وقلم سے وابستہ ہے تو کوئی مذہبی جریدہ یا رسالہ نکال رہا ہے- لیکن عمومی حیثیت سے یہ تمام افراد اپنے کاموں سے مسلمانوں کے ذہن وفکر پر مثبت اثرات مرتب نہیں کر پا رہے ہیں اور نہ ان کی فکر ونظر کو دین وسنیت کے سانچے میں ڈھال پا رہے ہیں- اس کی بنیادی وجہ اپنے کاموں سے غفلت اور تساہلی ہے- دراصل ہماری سوچ کا اس حیثیت سے ارتقا نہیں ہو سکا ہے کہ جب ہم کوئی کام کر رہے ہیں تو اس میں وقت، پیسہ اور توانائی تمام چیزیں صرف ہو ہی رہی ہیں، پھر کیوں نہ ہم اسے اپنی توجہ، محنت اور زمانی تقاضوں کے ساتھ اس طور پر کریں کہ وہ امت کی فکری اور عملی رہنمائی کا موثر ذریعہ بن جائے-

اسی طرح یہ بھی دیکھا گیا کہ مختلف کاموں کے ارتقا کے لیے ان کے بنیادی عناصر ہونے کے باوجود یا تو وہ جلد ہی منظرنامے سے غائب ہو گئے یا اپنی سست رفتاری سے بے فیض چلتے رہے- ایسے کاموں کے ذریعے نہ مطلوبہ نتائج برآمد ہو پاتے ہیں اور نہ ہماری سرگرمیوں کے اثرات محسوس کیے جاتے ہیں- دراصل عموماً ہمارے کاموں کا آغاز ہدف کے تعین کے بغیر وقتی جذبات کے زیر اثر ہوتا رہا ہے- اس بے سمتی نے ہماری کامیابیوں کا گراف بہت حد تک کم کر دیا ہے- کسی بھی کام کی ترقی اور کامیابی کے لیے ممکنہ وسائل کے ساتھ استقلال، مطلوبہ صلاحیت اور ہدف کی تعیین بنیادی لازمے ہیں- ان کے بغیر جو بھی قدم اٹھے گا، وہ منزل سے دور ہوتا جائے گا-

(۲) نومبر ۲۰۱۰ء کے اوائل میں ایک شام معروف قلم کار مولانا یاسین اختر مصباحی صاحب نے یاد فرمایا، ہم ان سے ملاقات کے لیے پہنچے تو انہوں نے یہ اطلاع دی کہ اگست ۲۰۱۱ء میں استاد مطلق مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی کے وصال کو ڈیڑھ سو سال مکمل ہو رہے ہیں، اس لیے ہمارا دینی وملی فریضہ ہے کہ ہم مختلف جہتوں سے علامہ کی خدمات کو اجاگر کریں، ہند وپاک میں اس حیثیت سے عوام وخواص میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور علامہ کے ساتھ عصری ومذہبی مورخین کا جو امتیازی سلوک رہا ہے اس کے ازالے کے لیے باقاعدہ مہم کا آغاز کیا جائے- اللہ کا

شکر ہے کہ ان کی اس مخلصانہ اپیل پر ہندوستان کی مرکزی شخصیتوں، اداروں اور رسائل وجرائد نے لبیک کہا اور کام کا آغاز ہو گیا۔

اٹھارہ سو ستاون کے مختلف روزنامچوں، دستاویزات، اخبارات اور خطوط کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں علمائے اہل سنت بالخصوص علامہ خیر آبادی کا بنیادی کردار رہا ہے، مگر یہ حقیقت پچھلے ڈیڑھ سو سال سے لمبی خاموشی اور مفروضہ تحقیقات کے ذریعے مسخ کی جاتی رہی، اس کی بنیادی وجوہات معروف محقق نادم سیتاپوری نے یوں بیان کی ہے:

''انگریز پرست مسلمان تو مولانا سے اس لیے خفا تھے کہ وہ سن ستاون کی جنگ آزادی میں مجاہدانہ اور باغیانہ کردار کے حامل رہ چکے تھے اور کٹر مذہبی حلقے اس لیے ناراض تھے کہ مولانا خیر آبادی حضرت شاہ اسماعیل شہید کے نظریات سے متفق نہیں تھے۔'' (سن ستاون اور فضل حق، ص:۶)

علامہ کے سلسلے میں یہ تجزیاتی ریمارک حقیقت کا عکاس ہے۔ علامہ کی دو حیثیتیں ہیں: ایک کا تعلق علم وتحقیق سے ہے اور دوسرے کا اعلائے کلمۂ حق سے۔ ان دونوں حیثیتوں سے ہندو پاک میں زیادہ کام نہیں ہو سکا۔ جن احسان شناس محققین نے ابتدائی نوعیت کے کام کیے انھیں آگے بڑھانا تو کیا دہرانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی۔ اپنے اس دینی وملی سرمایے کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی لیاقت اور استطاعت کے مطابق مندرجہ ذیل کام کریں:

(۱) علامہ خیر آبادی کے نام سے اداروں اور اداروں کے مختلف شعبوں کو منسوب کیا جائے (۲) سیمینارز اور کانفرنسز کا انعقاد کیا جائے (۳) مختلف جہتوں سے کتب ورسائل شائع کیے جائیں (۴) مضامین اور کتابیں لکھی جائیں (۵) علامہ کے یادگار حواشی اور کتابوں کی اشاعت کی جائے (۶) مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے علامہ کی قرار واقعی حیثیت کی تعیین کے لیے اپیل کی جائے (۷) نئی نسل کو علامہ سے متعارف کرانے کے لیے انٹرنیٹ پر کتب ومضامین اپ لوڈ کیے جائیں (۸) اور رسائل وجرائد کے خصوصی شمارے منظر عام پر لائے جائیں۔ اس طرح علامہ خیر آبادی سے ڈیڑھ سو سالہ بے اعتنائی کا تدارک کسی حد تک ہو سکے گا۔

(۳) دین ومسلک اور ملت کی مجموعی ترقی کے لیے دو چیزوں پر عقابی نگاہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ایک مسائل اور دوسری شخصیات۔ حالات کے بطن سے ابھرنے والے مسائل سے بے پروائی ہمارے دینی، ملی، مسلکی، سیاسی اور معاشی مستقبل کو تاریک کر دیتی ہے، جب کہ اپنی مرکزی شخصیات کو فراموش کرنے سے ہمارا رشتہ اپنے ماضی سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ مسائل پر جب ہماری نگاہ ہوتی ہے تو پھر ان کے مناسب حل کی تدبیریں بھی ہم تلاش کرتے ہیں، اس طرح ہم اپنے مستقبل کو متوقع حادثات سے محفوظ کر لیتے ہیں، بعینہٖ جب شخصیات کا ذکر وتعارف کرایا جاتا ہے تو ذکر وتعارف شخصی نہیں ہوتا بلکہ اس عہد کے دینی، ملی، تاریخی اور ثقافتی نظریات اور حالات کی حفاظت کا بھی سامان ہو جاتا ہے، اس طرح ہمارا موروثی رشتہ ہمیشہ اپنے ماضی سے مستحکم، متصل اور وابستہ رہتا ہے۔ ان دونوں سے ہی غفلت کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں مسلکی سطح پر اپنی حق وصداقت اور وجود وبقا کی جنگ لڑنی پڑ رہی ہے۔ یہاں یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ جس طرح مسائل وشخصیات سے غفلت نے ہم سے ہماری عمومی ترقی چھین لی ہے اسی طرح مسائل کے تدارک اور شخصیات کے تعارف وحفاظت کے خروش میں تشدد اور غلو کا مظاہرہ ہمیں تاریخی، علمی اور فکری حیثیت سے بے وزن اور ساقط الاعتبار بنا دیتا ہے۔ اس جہت سے بھی ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک عرصے تک ہماری کوشش رہی کہ ملت کو پیش آمدہ مسائل سے اعتدال کے ساتھ آگاہ کیا جاتا رہے۔ اب ایک نئے عزم کے ساتھ ہم فراموش کردہ شخصیات کے ذکر وتعارف کی مہم کا آغاز کرنے جا رہے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر ہر ماہ پورے شمارے کا انتساب کسی ایک شخصیت کے نام کیا جائے گا، متعلقہ شخصیت کا ایک مختصر سوانحی خاکہ دیا جائے گا اور ''تذکار'' کے کالم میں اس شخصیت پر ایک تفصیلی مضمون بھی شائع ہوگا۔ چوں کہ صحافت نام ہے ملت کی ذہنی وفکری تشکیل کا، جام نور کا یہ عمل یقیناً ہمیں اپنی فراموش کردہ شخصیات کے تفصیلی ذکر وتعارف پر آمادہ کرے گا اور غالب کا یہ نوحہ انھیں کچھ کر گزرنے کی دعوت دے گا کہ:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

□□□

اسید الحق محمد عاصم قادری ☆

مولانا عبدالحق خیرآبادی اوران کے تلامذہ کے علمی معرکے

اگست ۲۰۱۱ء میں مجاہد آزادی استاذ مطلق علامہ فضل حق چشتی خیرآبادی کی وفات کو ڈیڑھ سو سال ہونے جا رہے ہیں، اس سلسلے میں مختلف سطح پر علامہ کی علمی، دینی، ملکی اور قومی خدمات کے اعتراف میں ان کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے، رسائل وجرائد کے خصوصی شماروں کی تیاری ہے، ملک کے مختلف حصوں میں علامہ کی حیات وخدمات پر کانفرنس وسیمینار منعقد کیے جا رہے ہیں، ماہنامہ جام نور بھی ایک خصوصی شمارہ جاری کرنے کا عزم رکھتا ہے- اس سلسلہ میں علمی اور تحقیقی سطح پر جو کام کیے جا رہے ہیں ان میں دو کام اپنی نوعیت اور مواد کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں- (۱) ممتاز محقق وناقد مولانا اسید الحق قادری بدایونی ''خیرآبادیات'' کے نام سے ایک تحقیقی کتاب ترتیب دے رہے ہیں، جو اب تکمیل کے مراحل میں ہے، اب تک علامہ فضل حق خیرآبادی اور ان کے علوم ومعارف پر ہندو پاک میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، مولانا کی یہ کتاب اس دستیاب شدہ معلومات میں نہ صرف یہ کہ اضافہ کرے گی، بلکہ نایاب قلمی نسخوں کی مدد سے بہت سے ایسے گوشے بھی سامنے لائے گی جو اب تک محققین اور سوانح نگاروں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں- (۲) ۱۸۵۷ء کے معرکے میں دیگر دستاویزات کے علاوہ ''دہلی اردو اخبار'' کو خاصی اہمیت حاصل ہے، جس کے ۱۷ ر شمارے نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں محفوظ ہیں- ان شماروں اور دیگر اہم دستاویزات کے حوالے سے راقم ایک کتاب ''معرکۂ ۱۸۵۷ء دہلی اردو اخبار کی زبانی'' مرتب کر رہا ہے- اس کتاب کے حاشیے میں چند نایاب دستاویزات کے حوالے سے مذکورہ معرکے میں علما کی شمولیت کو ثابت کیا جائے گا- یہ دونوں کتابیں ان شاء اللہ جون کے آخر تک ہندو پاک دونوں جگہ سے بیک وقت شائع ہو رہی ہیں- مولانا اسید الحق قادری کا زیر نظر مضمون ان کی زیر ترتیب کتاب ''خیرآبادیات'' ہی کی ایک فصل ہے، جو کچھ حذف واضافے کے ساتھ ہماری خواہش پر مولانا نے جام نور کے لیے عنایت کیا ہے- (خوشتر نورانی)

خانوادۂ خیرآباد: برصغیر ہندو پاک کا وہ منفرد اور ممتاز خانوادہ ہے، جس کے فیضان علم سے کم وبیش برصغیر کی ہر دینی وعلمی درسگاہ اور دانش گاہ فیض یاب ہوئی ہے اور آج بھی اس خانوادہ کی تصانیف اور سلسلہ تلامذہ کے ذریعہ خیرآباد کا علمی ابر کرم تشنگان علوم کو سیراب کر رہا ہے، اسی خانوادے کے عظیم فرزند شمس العلما مولانا عبدالحق خیرآبادی ابن علامہ فضل حق خیرآبادی ہیں جنھوں نے اپنی تصانیف اور درسی خدمات سے اس خاندان کی عظمت کو نہ صرف یہ کہ برقرار رکھا بلکہ اوج ثریا تک پہنچا دیا، آپ کی ولادت ۱۲۴۴ھ/ ۹-۱۸۲۸ء میں ہوئی، جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل اپنے والد گرامی استاذ مطلق علامہ فضل حق خیرآبادی سے کی، لڑکپن میں ذہانت اور قابلیت کا یہ عالم تھا کہ اپنے والد کے حاشیہ قاضی مبارک پر محض ۱۴ ر سال کی عمر میں برجستہ اور فی البدیہہ ایک صفحہ لکھ کر رکھ دیا، مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی نے مولوی ظہیر احمد فاروقی خیرآبادی کی روایت نقل کی ہے کہ:

''جب علامہ (فضل حق خیرآبادی) قاضی کا حاشیہ تصنیف فرما رہے تھے تو ایک روز کسی ضرورت سے اٹھ کر کاغذات یوں ہی چھوڑ کر چلے گئے، مولانا عبدالحق جن کی عمر اس وقت ۱۴ ر سال تھی، باپ کے کمرے میں داخل ہوئے، اور عبارت کے آگے ایک صفحہ اپنے قلم سے تصنیف کر گئے، جب علامہ نے آ کر دیکھا تو دریافت کیا کہ ''کیا ابن میاں کمرے میں آئے تھے'' معلوم ہوا کہ آئے تھے، وہ صفحہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور اس صفحہ کو بجنسہٖ رہنے دیا- (۱)

جب حاشیہ قاضی اور مولانا عبدالحق کا ذکر ایک ہی مقام پر آ گیا ہے تو یہ بھی سنتے چلیں کہ جب جزیرہ انڈمان کی قید کے زمانے میں کسی نے علامہ فضل حق خیرآبادی سے پوچھا کہ ہندستان میں کیا یادگار چھوڑ کر آئے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ''دو یادگاریں چھوڑ آیا ہوں، ایک حاشیہ شرح سلم قاضی مبارک اور دوسری یادگار برخوردار عبدالحق''- (۲)

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مولانا عبدالحق کا علمی مرتبہ خود ان کے والد کی نگاہ میں کیا تھا- حاشیہ قاضی پر برجستہ ایک صفحہ لکھنے کا واقعہ اس وقت کا ہے جب آپ باقاعدہ درسیات سے فارغ بھی نہیں ہوئے

☆ Madrasa Qadria;Molvi Mohalla,Budaun(U.P)email:qadriusaid@yahoo.com

تھے،۱۶رسال کی عمر میں تمام درسیات معقول ومنقول سے فارغ ہوئے (۳) زمانہ طالب علمی میں جس "شاہین بچہ" کا یہ حال ہو عمر اور علم میں اضافے کے بعد اس کی پرواز کہاں تک پہنچی اس کو سمجھنے کے لیے صرف یہ واقعہ نقل کرنا کافی ہوگا کہ ایک مرتبہ مولوی اکرام اللہ شہابی گوپاموی نے مولانا عبدالحق خیرآبادی سے پوچھا کہ "بھائی صاحب !دنیا میں حکیم کا اطلاق کن کن پر ہے؟ مولانا نے فرمایا "بھیا ساڑھے تین حکیم دنیا میں ہیں، ایک معلم اول ارسطو، دوسرے معلم ثانی فارابی، تیسرے والد ماجد مولانا فضل حق اور نصف بندہ۔ (۴)

مولانا عبدالحق خیرآبادی کی ساری عمر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزری، سوانح نگاروں نے آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف کا ذکر کیا ہے (۱) حاشیہ قاضی مبارک (۲) حاشیہ غلام یحیٰ (۳) حاشیہ حمد اللہ (۴) حاشیہ میر زاہد امور عامہ (۵) شرح ہدایۃ الحکمۃ (۶) شرح مسلم الثبوت (۷) شرح کافیہ (۸) شرح سلاسل الکلام (۹) الجواہر الغالیہ (۱۰) رسالہ تحقیق تلازم (۱۱) شرح مرقات (۱۲) التحفۃ الوزیریہ (۱۳) زبدۃ الحکمۃ (۱۴) حاشیہ عقائد عضدیہ (۱۵) شرح حواشی الزاہد علی ملا جلال وغیرہ۔ (۵)

سیکڑوں ہزاروں لوگوں نے آپ کی درس گاہ سے علوم عقلیہ کی تحصیل کی، جن میں والیان ریاست اور مقتدر علمی خانوادوں کے افراد کے علاوہ ہندو بیرون ہند کے بے شمار تشنگان علوم شامل ہیں۔ ۲۳رشوال ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء کو رحلت فرمائی، اپنے آبائی وطن خیرآباد شریف میں مخدوم شیخ سعد کی درگاہ کے احاطے میں سپرد خاک کیے گئے۔

آپ نے اپنی تصانیف میں متعدد معاصرین اور متقدمین سے اختلاف رائے کیا، اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل پر بہت سے معقولی مسائل میں اپنی اجتہادی رائے پیش کی، جس کے نتیجے میں بعض معاصرین اور کچھ متاخرین سے علمی معرکہ آرائی کی نوبت آگئی، کچھ اہل علم نے آپ کی بعض تحقیقات پر نقد وجرح کی جس کے دفاع میں آپ کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ میدان کارزار میں کود پڑے اور علمی بحث ومناظرے کا بازار گرم ہوا، زیر نظر مضمون میں ہم مولانا اور ان کے تلامذہ کے انہیں علمی معرکوں کی سرگزشت پیش کرنے جا رہے ہیں، یہ معرکے علمی حوالے سے دلچسپ بھی ہیں اور اس زاویے سے سبق آموز بھی کہ وہ کیسے لوگ تھے جو ایک طرف تو میدان تحقیق وتنقید میں ایک دوسرے کے مدمقابل اور باہم برسر پیکار تھے، اور دوسری طرف ایک دوسرے کے ایسے قدر ومنزلت شناس تھے کہ پاس ولحاظ اور ادب واحترام کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور مولانا عبدالحق خیرآبادی: مولانا عبدالحی فرنگی محلی (ولادت: ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷ء- وفات: ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) اور مولانا عبدالحق خیرآبادی یہ دونوں عظیم علمی خانوادوں کے قابل فخر فرزند تھے، دونوں بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے، اور اپنے معاصرین میں منفرد وممتاز تھے، مولانا عبدالحق خیرآبادی عمر میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے ۲۰ربرس بڑے تھے، ان دونوں حضرات کے درمیان ایک دلچسپ علمی معرکہ آرائی ہوئی، جو اب تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے۔ اس معرکہ آرائی کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

رسالہ قطبیہ پر علامہ میر زاہد ہروی کا حاشیہ ہے، اس پر علامہ غلام یحیٰ بہاری کا حاشیہ لواء الهدیٰ فی اللیل والدجیٰ کے نام سے ہے، آج سے کچھ عرصہ پہلے تک یہ کتاب درس نظامی میں داخل تھی، مولانا عبدالحق صاحب نے ۱۲۷۷ھ میں لواء الہدیٰ پر حاشیہ لکھا، جو ۱۲۷۸ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا، ۱۲۸۰ھ میں جب مولانا عبدالحی فرنگی محلی اپنے والد مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی سے رسالہ میر زاہد مع لواء الہدیٰ پڑھ رہے تھے، تو آپ نے لواء الہدیٰ پر حاشیہ لکھا، جس کا نام "هداية الوریٰ الیٰ لواء الهدیٰ" رکھا، اس حاشیہ میں جہاں انہوں نے لواء الہدیٰ کے دوسرے محشین پر نقد وجرح کی وہیں مولانا عبدالحق خیرآبادی کا حاشیہ بھی بحث وتنقید کی زد میں آگیا، یہاں یہ بات نہ صرف قابل ذکر ہے بلکہ باعث استعجاب بھی ہے کہ جس وقت مولانا عبدالحی فرنگی محلی مولانا عبدالحق سمیت دوسرے اعاظم مناطقہ کی آرا پر نقد ونظر فرما رہے تھے اس وقت آپ کی عمر محض ۱۶رسال تھی...... ع

آفریں باد بریں ہمت مردانہ تست

۶رسال کے بعد یعنی ۱۲۸۶ھ میں آپ نے لواء الہدیٰ پر ایک اور مفصل حاشیہ تحریر فرمایا جس کا نام "مصباح الدجیٰ فی لواء الهدیٰ" رکھا، یہ ایسا عظیم الشان حاشیہ ہے کہ اگر علم منطق میں مولانا کی کوئی اور کتاب نہ بھی ہوتی تو تن تنہا مصباح الدجیٰ مولانا کو کبار مناطقہ کی صف اول میں کھڑا ہونے کا مستحق ثابت کرنے کے لیے کافی تھی، اس میں آپ نے مولانا عبدالحق خیرآبادی کے حاشیہ پر کچھ نئے

اعتراضات کیے اور گزشتہ اعتراضات کو مزید مدلل کیا، مولانا کے ان دونوں حاشیوں کے اعتراضات کا جواب مولانا عبدالحق خیرآبادی کے ایک شاگرد کے نام سے منظر عام پر آیا، مولانا عبدالحق خیرآبادی کے اس جواب پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے ۱۲۸۷ھ میں جواب الجواب لکھا اور اس رسالے کا نام "نور الھدیٰ لحملة لواء الھدیٰ" رکھا، اس کے علاوہ انہوں نے اپنے حاشیے مصباح الدجیٰ پر بھی تعلیقات قلم بند کیں اور اس میں انہوں نے مولانا عبدالحق خیرآبادی کے ان اعتراضات کا جواب دیا جو انہوں نے اس حاشیہ کے بعض مقامات پر کیے تھے- اس مباحثے کے تقریباً دس بارہ برس بعد مولانا عبدالحق خیرآبادی نے پھر ان حواشی کی طرف توجہ کی اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے جواب میں ایک اور رسالہ لکھا، یہ بھی کسی شاگرد کے نام سے ہی منظر عام پر آیا، اس کے جواب میں مولانا نے ۱۳۰۲ھ میں ایک رسالہ قلم بند فرمایا جس کا نام "علم الہدیٰ" رکھا، معلوم نہیں پھر اس کے جواب میں خیرآبادی علما کی طرف سے کچھ لکھا گیا یا نہیں-

اس معرکے میں کچھ تو اصولی اور علمی مسائل زیر بحث آئے اور کہیں محض لفظی گرفتیں کی گئیں ہیں، قیل وقال کے درمیان کہیں کہیں مزاح لطیف اور طنز ملیح کی صورت بھی پیدا ہوگئی، یہاں ہم اس مباحثہ سے صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں-

ہدایۃ الوریٰ میں ایک بحث کے دوران علامہ غلام یحییٰ بہاری نے ضمناً ایک بات ارشاد فرمائی کہ:

کما ان النسبة داخلة فی مفهوم القضية دون حقيقتها(٦)

جیسا کہ نسبت صرف قضیہ کے مفہوم میں داخل ہے نہ کہ قضیے کی حقیقت میں-

اس پر مولانا عبدالحق خیرآبادی نے علامہ غلام یحییٰ سے اختلاف رائے کرتے ہوئے اس کو علامہ غلام یحییٰ کا "سفسطہ" قرار دیا، اس پر ایک طویل بحث کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

والحاصل ان النسبة مناط القضية ومدارها فكيف يظن انها خارجة عن حقيقتها(٧)

خلاصہ یہ کہ نسبت ہی پر قضیہ کا مناط ومدار ہے لہٰذا یہ کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ نسبت قضیے کی حقیقت سے خارج ہو-

مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے مولانا عبدالحق کی اس پوری بحث کو چھ وجوہ سے رد کر دیا، اور آخر میں لکھا کہ:

فقد ظهر من هذالبيان الواضح والتبيان اللائح ان هذاالكلام من اوله الیٰ آخره مغالطة وان نسبة السفسطة الی الشارح صدرت عن غفلة(٨)

اس واضح بیان سے ظاہر ہوگیا کہ (مولانا عبدالحق کا) یہ کلام از اول تا آخر مغالطے پر مبنی ہے اور شارح (علامہ غلام یحییٰ) کی طرف سفسطہ کی نسبت غفلت کی وجہ سے صادر ہوگئی ہے-

مولانا عبدالحق خیرآبادی نے یہ جو فرمایا تھا کہ "نسبت ہی پر قضیہ کا مناط ومدار ہے لہٰذا یہ کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ نسبت قضیے کی حقیقت سے خارج ہو" اس کا رد کرتے ہوئے مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے ایک جملہ یہ لکھ دیا کہ:

وهل هذا كما يقال الوضوء مناط الصلوة ومدارها فكيف يظن انها خارج عن حقيقتها وهذا عجيب(٩)

یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ "وضو پر نماز کا دار ومدار ہے لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وضو نماز کی حقیقت سے خارج ہو" یہ کتنی عجیب بات ہے- مولانا عبدالحق خیرآبادی نے اس کا معقول جواب تو دیا ہی مگر ساتھ ہی مولانا عبدالحی صاحب پر ایک چوٹ بھی کر گئے فرماتے ہیں کہ:

اما ذكر مسئلة الوضوء والصلوة فی هذاالمقام فهو يدل علیٰ كونه جامعاً بين المعقول والمنقول ولو اورد فی هذا المبحث مسائل الطلاق والعتاق والبيع والشراء وغيرها لكان اعدل شاهداً علیٰ فقاهته واول دليلاً علیٰ سفاهته(١٠)

اس مقام پر وضو اور نماز کے مسئلے کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ جناب معقول ومنقول کے جامع ہیں، اگر محترم اس بحث میں طلاق وعتاق، خرید وفروخت اور شفعہ وغیرہ کے بھی کچھ مسائل ذکر دیتے تو یہ موصوف کی فقاہت پر بہترین گواہ اور سفاہت کی اولین دلیل ہوتی-

اس پر مولانا عبدالحی کہاں خاموش رہنے والے تھے، انہوں نے بھی جواب آں غزل کے انداز میں چٹکی لی، فرماتے ہیں:

هذا عجيب جداً ممن يعد من علماء المسلمين ،نعم لا يستبعد مثله من السفيه الذی لا يتوضأ ولا يصلی ويتنفر عن ذكر اركان الدين-(١١)

جس شخص کا شمار مسلمانوں کے علما میں ہوتا ہو اس سے یہ بات کتنی عجیب ہے، ہاں البتہ اس قسم کی باتیں ایسے احمق سے بعید نہیں جو نہ وضو کرتا ہو نہ نماز پڑھتا ہو، اور ارکان دین کے ذکر سے نفرت کرتا ہو۔

۱۹۹۶ء/۱۹۹۷ء میں راقم الحروف نے استاذ محترم علامہ خواجہ مظفر حسین صاحب کی درس گاہ میں رسالہ میر زاہد مع حاشیہ غلام یحیٰ پڑھنے کی سعادت حاصل کی تھی، استاذ محترم کے حکم کے مطابق مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا حاشیہ مصباح الدجیٰ زیر مطالعہ رکھتا تھا، اور کبھی کبھی مولانا عبدالحق خیرآبادی کے حاشیہ کا بھی مطالعہ کرتا تھا، مولانا عبدالحی صاحب کی سب سے بڑی خوبی ان کی سہل نگاری ہے، مشکل سے مشکل بحث آسان سے آسان تر انداز میں لکھنے کا جو ملکہ اللہ نے ان کو ودیعت کیا تھا وہ بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے، اس کے برخلاف مولانا عبدالحق کے قلم پر ان کا علمی رعب ودبدبہ اور محققانہ گہرائی وگیرائی اس قدر حاوی ہوتی ہے کہ ان کی بات ہم جیسے کم فہم طلبہ کی سمجھ میں ذرا مشکل سے ہی آتی ہے، اس لیے ہم جیسا کوئی کم علم طالب علم اگر ان دونوں حضرات کے مباحث کو دیکھے گا تو مولانا عبدالحق صاحب کے مقابلے میں مولانا عبدالحی صاحب کی حمایت کرتا نظر آئے گا، جو یقیناً اس کے قصور فہم کا نتیجہ ہوگا، کیوں کہ ان دونوں عبقری شخصیات کے درمیان صحیح اور غلط کا فیصلہ وہ کرے جو انہی کی طرح بلند علمی مقام رکھتا ہو۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی: مفتی سعد اللہ مرادآبادی (ولادت: ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء، وفات: ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء) اپنے وقت کے جید عالم تھے، لکھنؤ میں مدتوں قضا اور افتا کے عہدوں پر فائز رہے، مؤلف تذکرۂ علمائے ہند نے مختلف علوم وفنون میں ان کی ۳۱/ تصانیف کا ذکر کیا ہے جس سے ان کے علم وفضل کا اندازہ ہوتا ہے (۱۲) مفتی صاحب علامہ فضل حق خیرآبادی کے نہ صرف معاصر بلکہ علمی اور تحقیقی میدان میں حریف تھے، علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی کے علمی معرکوں کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب: ''خیرآبادیات'' میں نقل کی ہے، ایک مرتبہ انہیں مفتی سعد اللہ کے ایک تلمیذ مولانا فدا حسین اور مولانا عبدالحق خیرآبادی کے درمیان علمی معرکہ آرائی کی نوبت آگئی، ہوا یوں کہ مفتی سعد اللہ مرادآبادی نے فلسفہ کی مشہور کتاب شرح ہدایت الحکمۃ لصدر الشیرازی پر کچھ تعلیقات تحریر فرمائیں، جب مفتی صاحب کی تعلیقات منظر عام پر آئیں تو ان پر مولانا عبدالحق خیرآبادی نے ۴/ اعتراضات کیے، ان ۴/ اعتراضات کے جواب میں مفتی سعد اللہ مرادآبادی کے شاگرد مولانا محمد فدا حسین نے قلم اٹھایا اور اپنے استاذ کے دفاع میں ایک رسالہ قلم بند کیا، اس میں انہوں نے پہلے مولانا عبدالحق خیرآبادی کے ان چاروں اعتراضات کا جواب دیا اور ساتھ ہی مولانا عبدالحق خیرآبادی کے والد اور دادا پر چار اعتراضات بھی کر دیے، پہلے تین اعتراضات علامہ فضل حق خیرآبادی کی کتاب ہدیہ سعیدیہ پر تھے، اور ایک اعتراض علامہ کے والد مولانا فضل امام خیرآبادی کی کتاب ''شرح میزان منطق'' کی ایک عبارت پر تھا، مولانا فدا حسین کے اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ قادریہ بدایوں میں محفوظ ہے، معلوم نہیں کہ اس کے جواب میں مولانا عبدالحق خیرآبادی یا آپ کے تلامذہ میں سے کسی نے کچھ لکھا یا پھر یہ سلسلہ یہیں ختم ہوگیا۔

مولانا فضل حق رامپوری اور حاشیہ میر زاہد امور عامہ: مولانا عبدالحق خیرآبادی نے حاشیہ میر زاہد (بر شرح مواقف امور عامہ) پر ایک تحقیقی حاشیہ تحریر فرمایا، اسی میر زاہد امور عامہ پر مولانا فضل حق رامپوری (ولادت: ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء - وفات: ۱۳۵۸ھ/۱۹۴۰ء) پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور نے بھی حاشیہ تحریر فرمایا، مولانا فضل حق رامپوری اپنے زمانے کے متبحر عالم اور محقق ومدرس تھے، سلسلۂ چشتیہ میں حضرت سیدنا پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت بیعت رکھتے تھے (۱۳) اگرچہ مولانا فضل حق رامپوری بھی میخانۂ خیرآبادی کے بادہ نوش تھے، وہ مفتی لطف اللہ علی گڑھی کے شاگرد رشید ہونے کے علاوہ مولانا ہدایت علی بریلوی (تلمیذ علامہ فضل حق خیرآبادی) اور مولانا عبدالعزیز سہارنپوری (تلمیذ مولانا عبدالحق خیرآبادی) سے بھی نسبت تلمذ رکھتے تھے، اور جس زمانے میں مولانا عبدالحق خیرآبادی مدرسہ عالیہ رامپور میں پرنسپل تھے اسی زمانے میں مولانا فضل حق صاحب نے مدرسے میں مدرس ہونے کے باوجود ان سے کچھ اکتساب فیض کیا تھا، لیکن اس کے باوجود بھی انہوں نے اپنے حاشیہ بر میر زاہد امور عامہ میں دلائل کے ساتھ مولانا عبدالحق خیرآبادی سے اختلاف کیا، اور جگہ جگہ ان پر اعتراضات کیے، بھلا خیرآبادی علما اس کو کہاں برداشت کر سکتے تھے، چنانچہ اس حاشیہ کو لے کر ایک نیا علمی معرکہ چھڑ گیا، مولانا فضل حق رامپوری کے ان اعتراضات کے جواب میں ایک رسالہ منظر عام پر آیا جس میں مصنف کی حیثیت سے مولوی عبداللہ انصاری کا نام درج

تھا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ فرضی نام ہے اس رسالے کے اصل مصنف مولانا محمد طیب مکی (تلمیذ مولانا عبدالحق خیرآبادی) ہیں، دوسرا رسالہ "التحقیق المطلق علیٰ مسلک عبدالحق" کے نام سے منظر عام پر آیا، جس پر مصنف کی حیثیت سے مولوی عطاء اللہ (تلمیذ مولانا ہدایت اللہ رامپوری شاگرد علامہ فضل حق خیرآبادی) کا نام تھا، مگر تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ بھی فرضی نام ہے، رسالہ کسی اور کا ہے (۱۴) ان دونوں رسالوں کے جواب میں مولانا فضل حق رامپوری نے "الظفر الحامدی علیٰ المجیب المکی والمجیب المخفی" نامی رسالہ تحریر کیا، یہ رسالہ محرم ۱۳۲۴ھ میں لکھا گیا اور اسی سال مطبع سعیدی رامپور سے طبع ہوا۔

مولانا فضل حق رامپوری کے ایرادات کو دفع کرنے کے لیے ایک اور خیرآبادی فاضل نے قلم اٹھایا، یہ تھے علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری (تلمیذ مولانا سید برکات احمد ٹونکی تلمیذ مولانا عبدالحق خیرآبادی) نے "ازاحۃ شبہات الشادی عن کلام الفاضل الخیرآبادی" کے نام سے ایک رسالہ تصنیف فرمایا، اس پر مولانا محمد شریف سمیتوی (مدرس مدرسہ نعمانیہ لاہور) نے تقریظ لکھی، ۹۶/صفحات پر مشتمل یہ رسالہ مطبع مفید عام لاہور سے ۱۳۲۵ھ میں اشاعت پذیر ہوا۔

مولانا محمد شریف صاحب نے اپنی تقریظ میں اس رسالہ کی تصنیف کا جو پس منظر تحریر کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

"امور عامہ پر حاشیہ زاہدیہ بہت مغلق اور دقیق ہے، اس کے اسرار خواص پر پوشیدہ رہے چہ جائے کہ عام علما اور فضلا پر، کسی نے ایسی تحریر نہیں لکھی جو اس کے مغلقات کو واضح کرتی، اور نہ کسی نے ایسی تعلیق لکھی جو اس کے مشکلات کی وضاحت کرتی، اس کے جتنے بھی حواشی ہیں وہ یا تو بہت طویل ہیں یا پھر انتہائی مختصر ہیں، لہٰذا استاذ الاساتذہ علامہ عبدالحق خیرآبادی نے اس پر ایسا حاشیہ تحریر فرمایا جو اس کے رموز و اسرار کو کھولنے والا ہے، چنانچہ علامہ کا یہ حاشیہ علما کے درمیان مقبول ہوا، لیکن حاسدین اس کو دیکھ کر اپنی آتش حسد میں جل گئے، اور مولوی فضل حق رامپوری نے اس پر اعتراضات کیے، جب ان اعتراضات کی خبر علامہ سید برکات احمد ٹونکی کو ہوئی تو انہوں نے متواتر کئی خطوط مولانا فضل حق رامپوری کو لکھے کہ آپ ان اعتراضات کے سلسلے میں بالمشافہ مجھ سے مباحثہ کرلیں، مولانا فضل حق رامپوری نے ان کو رامپور آنے کی دعوت دی، جب مولانا سید برکات احمد ٹونکی اپنے تلامذہ کے ساتھ رامپور پہنچے اور مولانا فضل حق کے پاس اپنی آمد کی خبر بھیجی تو مولانا نے یہ بہانہ کردیا کہ ان کا بیٹا بیمار ہے لہٰذا وہ نہیں آسکتے، جب دوبارہ ملاقات کا وقت مانگا تو انہوں نے پھر وہی عذر کردیا، تیسری بار مولانا ٹونکی نے کہلوایا کہ میں مناظرے کے لیے نہیں بلکہ آپ کے بیٹے کے معالجے کے لیے آنا چاہتا ہوں کیوں کہ میں ایک طبیب بھی ہوں، لیکن پھر بھی مولانا رامپوری ملاقات پر آمادہ نہیں ہوئے، اس درمیان ان کو کئی خطوط لکھے گئے مگر انہوں نے کسی کا جواب نہیں دیا تو مولانا ٹونکی صاحب نے سمجھ لیا کہ یہ مناظرے کو تیار نہیں ہوں گے، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ ان اعتراضات کا تحریری جواب لکھ دیں تو آپ تیار نہیں ہوئے، لہٰذا لوگ ان کے تلمیذ رشید مولانا معین الدین اجمیری کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ سے درخواست کی، پہلے تو آپ نے اپنی تدریسی مصروفیات کا عذر کیا لیکن جب لوگوں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو آپ نے یہ رسالہ تالیف فرمایا"۔ (۱۵)

مولانا محمد شریف صاحب کے اس بیان میں ہمیں عقیدت مندانہ مبالغہ محسوس ہورہا ہے کیوں کہ مولانا فضل حق رامپوری بہر حال ایک متبحر، معقولی، متقی اور پرہیز گار عالم تھے، ان سے اس قسم کے غیر علمی اور غیر اخلاقی رویہ کی امید نہیں کی جاسکتی۔ واللہ اعلم

ازاحۃ شبہات الشادی کے جواب میں مولانا فضل حق رامپوری کے شاگرد رشید اور معقول ومنقول کے جامع مولانا غلام محمد چشتی گھوٹوی (ولادت: ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۶ء- وفات: ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) نے ایک رسالہ "ظفر الحق والصداقۃ" تحریر فرمایا، اس کے جواب میں پھر مولانا معین الدین میدان میں آئے اور "ازاحۃ اوہام الغفول عن کلام امام المعقول" نامی رسالہ تصنیف فرمایا (۱۶) یہ رسالہ راقم سطور کی نظر سے نہیں گزرا، نہیں معلوم کہ اس کے جواب میں علمائے رامپور کی جانب سے کچھ لکھا گیا یا یہ سلسلہ یہیں ختم ہوگیا۔

مولانا معین الدین اجمیری اور مولانا فضل حق رامپوری کے درمیان ہونے والے علمی معرکے کی تفصیل آپ نے ملاحظہ کی، اب ذرا تصویر کا ایک دوسرا رخ دیکھیں، یہی مولانا فضل حق رامپوری اس معرکے کے تقریباً ۱۵/برس کے بعد ۱۹۳۲ء/۱۹۳۳ء میں مدرسہ معینیہ اجمیر شریف میں ممتحن کی حیثیت سے جلوہ فرما ہوئے، مولانا معین

الدین اجمیری مدرسے کے صدر مدرس تھے، مولانا عبدالسلام خاں رامپوری لکھتے ہیں کہ مولانا معین الدین اجمیری نے مولانا فضل حق رامپوری کا تعارف ان الفاظ میں کروایا کہ:

آج میں ایسے فاضل کو پیش کر رہا ہوں جو اس لیے بڑا نہیں ہے کہ بڑوں کی موت نے اسے بڑا بنایا ہے بلکہ یہ وہ بڑا ہے جس کو بڑوں نے جب وہ زندہ تھے بڑا مانا تھا-(۱۷)

محاکمات اور شرح اشارات جیسی کتابوں کا امتحان لیا، اس کے بعد کیا ہوا یہ خود ایک عینی گواہ کی زبان سے سنیے، مولانا معین الدین اجمیری کے شاگرد مولانا محمد اسرائیل پشاوری (جو ان طلبہ میں شامل تھے جن کا امتحان لیا گیا تھا) فرماتے ہیں:

امتحان لینے کے بعد علامہ فضل حق صاحب بہت خوش ہوئے اور تعریفی کلمات میں حضرت استاذی (مولانا معین الدین اجمیری) مدظلہ کے کام کو سراہ رہے تھے، اتفاق سے ان کے ایک ساتھی (خادم) کا نام معین الدین تھا، انہیں نام لے کر پکارا تو حضرت علامہ (معین الدین اجمیری) آگے بڑھے، اور فرمایا ''فقیر حاضر ہے'' اس پر علامہ رامپوری بہت نادم ہوئے، اور فرمایا ''آپ تو مخدوم معین الدین ہیں'' یہ ان حضرات کے اخلاق عالیہ کا کمال تھا، ورنہ ہر دو حضرات کے مناظرے بھی ہوئے تھے اور شائع بھی ہوئے تھے، مگر چونکہ علامہ رامپوری عمر میں بڑے تھے اور عالی جناب حکیم برکات احمد کے ہم زمان تھے، اس لیے استاذی مدظلہ بھی ان کی استاذانہ قدر کرتے تھے-(۱۸)

یہ ہے علمائے ربانیین کا طرز عمل کہ آپس میں علمی اختلافات بھی ہیں، مناظرے بھی ہو رہے ہیں، جواب اور جواب الجواب میں رسالے بھی شائع ہو رہے ہیں، اس کے باوجود بھی جب ان کی باہم کہیں ملاقات ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے کے مقام و مرتبے کا پاس ولحاظ کرنے اور ایک دوسرے کا ادب واحترام کرنے میں ہر آدمی دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے، یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون کس کا زیادہ ادب واحترام کر رہا ہے- کہنے والے نے درست کہا ہے کہ ''بڑوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں''-رب قدیر ان سب کے درجات بلند فرمائے-

مناظرۂ رامپور: یہ مناظرہ اگرچہ مولانا عبدالحق خیرآبادی سے نہیں ہوا تھا، مگر انہیں پر اعتراضات کے نتیجے میں ان کے ایک شاگرد اور شاگرد کے شاگرد سے ہوا تھا، جس کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں ہے-اس مناظرے کی تفصیلات حکیم محمود احمد برکاتی نے اپنی دو کتابوں ''مولانا حکیم سید برکات احمد سیرت اور علوم'' (برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۹۳ء) اور مولانا معین الدین اجمیری: کردار وافکار (برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۹۳ء) میں اور مولانا عبدالسلام خاں رامپوری نے ''برصغیر میں علمائے معقولات اور ان کی تصانیف'' (خدا بخش لائبریری پٹنہ ۱۹۹۶ء) میں درج کی ہیں، ہم نے اس روداد مناظرہ کے سلسلہ میں انہی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، اس مناظرے کی تقریب کچھ یوں ہوئی کہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے ایک شاگرد مولانا عبدالوہاب بہاری (وفات: ۱۳۳۵ھ) تھے، اپنے زمانے میں معقولات کی تدریس میں منفرد مقام رکھتے تھے، مدرسہ عالیہ کلکتہ میں استاذ رہے، حکومت برطانیہ کی جانب سے ''شمس العلما'' کا خطاب بھی ملا تھا، اور ''فخر بہار'' کے لقب سے مشہور تھے، انہوں نے رسالہ میر زاہد پر صحیفہ ملکوتیہ کے نام سے حاشیہ تصنیف فرمایا، جس میں جگہ جگہ اپنے استاذ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا دفاع کرتے ہوئے مولانا عبدالحق خیرآبادی پر اعتراضات کیے، فخر بہار کی خواہش تھی کہ اس کتاب کی اشاعت کے اخراجات نواب حامد علی خاں والی ریاست رامپور ادا فرمادیں، اسی مقصد سے مولانا عبدالوہاب بہاری رامپور آئے ہوئے تھے، مولوی محمد علی صاحب عرف صاحبزادہ چھٹن (تلمیذ مولانا عبدالحق خیرآبادی) جو نواب رامپور کے عزیز بھی تھے، جب انہوں نے کتاب دیکھی تو یہ گوارا نہیں کیا کہ جس کتاب میں ان کے استاذ مولانا عبدالحق خیرآبادی پر اعتراضات کیے گئے ہوں وہ ریاست رامپور کے مصارف پر اشاعت پذیر ہو، صاحبزادہ چھٹن صاحب نے یہ تجویز رکھی کہ آپ ان اعتراضات کے سلسلے میں مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی (تلمیذ مولانا عبدالحق خیرآبادی) سے مناظرہ کرلیں، اگر آپ ان کو شکست دے دیں تو یہ تسلیم کرلیا جائے گا کہ یہ اعتراضات درست ہیں اور ریاست اس کتاب کی طباعت کے اخراجات ادا کرے گی، مولانا عبدالوہاب صاحب نے یہ تجویز منظور فرمالی، حکیم صاحب کو دعوت دی گئی، آپ نے منظور فرمائی اور رامپور کا قصد کیا، جب مناظرے کے سلسلے میں حکیم صاحب کے رامپور جانے کا شہرہ ہوا تو آپ کے بہت سے تلامذہ اجمیر، پٹنہ، دربھنگہ، الٰہ آباد، بنارس اور سہارن پور سے رامپور کے لیے روانہ ہوگئے، اور بقول حکیم محمود احمد برکاتی:

"ریاست کے سرکاری مہمان خانے میں چند دن کے لیے مناطقہ ہند کا مرکز ثقل منتقل ہوگیا۔" (۱۹)

مولانا سید برکات احمد ٹونکی کے ساتھ ان کے شاگرد رشید علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری صاحب بھی تھے، یہ خیرآبادی قافلہ ریاست رامپور میں خیمہ زن ہوگیا مگر مولانا عبدالوہاب صاحب کی جانب سے مجلس مناظرہ کے انعقاد میں تامل اور تذبذب کا مظاہرہ ہوتا رہا، جب کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو آخر ایک دن مولانا معین الدین اجمیری صاحب ملاقات کے لیے مولانا عبدالوہاب بہاری کے دولت کدہ پر پہنچ گئے، ادھر اُدھر کی گفتگو ہوئی، اسی میں کہیں مولانا عبداللہ ٹونکی کا ذکر خیر بھی آگیا، آگے کی گفتگو خود مولانا معین الدین اجمیری کی زبانی ملاحظہ کریں، فرماتے ہیں:

فخر بہار فرمانے لگے "انہوں نے (مولانا عبداللہ ٹونکی نے) حمداللہ کے حاشیے میں کس قدر فاش غلطی کی ہے کہ قضیہ کو معقولات ثانیہ میں داخل کردیا ہے" یہ کہہ کر فخر بہار ان کی تحریر پر سخت تعجب کرنے لگے، فقیر حقیر نے فخر بہار کے اس تعجب پر متعجب ہوکر کہا کہ یہ فاش غلطی تو کیا غلطی بھی نہیں ہے، اگر مولوی عبداللہ صاحب نے ایسا لکھا تو بالکل بجا اور صحیح لکھا کیونکہ قضیہ کا معقولات ثانیہ سے ہونا ایک اجماعی مسئلہ ہے، زاں بعد فقیر اس امر کا منتظر تھا کہ اب فخر بہار کچھ ارشاد فرمائیں، لیکن انہوں نے ایسی چپ سادھی کہ یہ مسئلہ تو درکنار تذکرہ اہل علم ہی کو اڑا گئے۔ (۲۰)

اپنی قیام گاہ پر واپس آکر مولانا معین الدین اجمیری نے قضیہ کے معقولات ثانیہ سے ہونے یا نہ ہونے پر مولانا عبدالوہاب بہاری صاحب کو دعوت مناظرہ دی، طرفین سے تحریروں کا تبادلہ ہوا، مولانا عبدالوہاب صاحب نے مولانا معین الدین اجمیری سے مناظرہ کرنا اپنے مقام سے فروں گمان کیا کہ وہ ان سے عمر میں چھوٹے تھے، ہاں البتہ مولانا اجمیری کے استاذ مولانا سید برکات احمد ٹونکی سے مناظرہ کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ صاحبزادہ چھٹن صاحب کی کوششوں سے یہ مناظرہ ۱۵ر رمضان ۱۳۳۴ھ/ ۷ر جولائی ۱۹۱۶ء کو "خاص باغ" میں نواب حامد علی خاں والی ریاست رامپور کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں رامپور اور اطراف کے بہت سے معقولی علما نے شرکت کی، بقول حکیم محمود احمد برکاتی:

یہ مناظرہ علمائے عقلیات کے درمیان غالباً تاریخ کا آخری قابل ذکر مناظرہ تھا، اس کے بعد تو بساط ہی الٹ گئی، اب عقلیات ہی کی قدر باقی رہی نہ علمائے عقلیات کی، قدریں ہی بدل گئیں، وہ موضوعات رہے نہ مسائل، ان کے سمجھنے والے ہی اٹھ گئے، ان میں الجھنے والے دکان بڑھا گئے، وہ نظریات، وہ مسائل، وہ شخصیات سب اس دور کے لیے اجنبی ہوکر رہ گئے۔ (۲۱)

مجلس مناظرہ آراستہ ہوئی اور ریاست رامپور کے اخبار دبدبۂ سکندری کے مطابق:

حکیم صاحب (مولانا سید برکات احمد) نے اپنی پرزور تقریر سے اس (قضیہ) کا معقولات ثانیہ سے ہونا ثابت کردیا تو جناب مولانا مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری بجز اس کے کچھ نہ فرما سکے کہ یہ تو میں نے کسی سے نہیں سنا یہ تو جدید تحقیق ہے، اس پر حاشیہ حمداللہ مصنفہ حضرت مولانا عبدالحق قدس سرہ سے، جس میں عبارت افق المبین سے یہ امر ثابت ہورہا تھا پیش کیا گیا جس کو حضور معلیٰ (نواب حامد علی خاں) دام ملکہم نے بذات خود جناب مولانا مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری کو سمجھادیا۔ (۲۲)

اس مجلس مناظرہ میں مولانا فضل حق رامپوری بھی تشریف فرما تھے، مولانا برکات احمد ٹونکی اور ان کے تلامذہ سے مولانا فضل حق رامپوری کے علمی معرکے کی روداد آپ پڑھ چکے، اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مولانا فضل حق رامپوری موقع سے فائدہ اٹھا کر حکیم برکات احمد صاحب کی شکست کے درپے ہوجاتے، اور اپنی گزشتہ معرکہ آرائی کا بدلہ لے لیتے، مگر آپ مولانا فضل حق کی اعلیٰ ظرفی ملاحظہ فرمائیں، مولانا کے شاگرد مولانا عبدالسلام خاں رامپوری روایت کرتے ہیں کہ مولانا فضل حق رامپوری نے فرمایا کہ:

میں نے محسوس کیا کہ عبدالوہاب الٹی ہیر رہے ہیں (۲۳) اور جواب بن نہیں پڑرہا ہے تو میں نے حکیم برکات احمد کے سوال کی تشریح کرتے ہوئے جواب کی طرف اشارہ کردیا، پھر ایک موقع پر برکات احمد دشواری میں پڑ گئے، میں نے عبدالوہاب بہاری کی بات کی تشریح کی اور جواب کی طرف اشارہ کیا، بہرحال میں نے دونوں حضرات کی بحث کو نزاع لفظی قرار دیتے ہوئے فیصلہ کردیا اور اس طرح نواب صاحب کے سامنے دونوں کی بات رہ گئی۔ (۲۴)

یہی وہ اعلیٰ ظرفی، کشادہ قلبی، اور وضع داری ہے جو انسان کو بڑا بناتی ہے، مناظرہ ختم ہوا تو دونوں فریق نے اپنے اپنے طور پر فتح وکامرانی کا سہرا اپنے سر باندھا، اس سے مولانا برکات احمد کے تلامذہ اور مولانا عبدالوہاب صاحب اور ان کے تلامذہ کے درمیان ایک تحریری جنگ چھڑ گئی، اس سلسلہ میں خیرآبادی خیمے کی جانب سے جو رسائل اور کتابچے منظر عام پر آئے ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) ازالة اوهام العادی عن كلام الفاضل الخیر آبادی: مولانا عبدالعزیز بہاری (تلمیذ مولانا مقبول احمد دربھنگوی تلمیذ مولانا برکات احمد ٹونکی) مطبوعہ اخلاق پریس بانکی پور-

(۲) مانع غلط فہمی: مولانا عبدالعزیز بہاری (تلمیذ مولانا مقبول احمد دربھنگوی تلمیذ مولانا برکات احمد ٹونکی) مطبوعہ مطبع مجیبی پھلواری شریف

(۳) عجائب الدہور: مولانا عبدالعزیز بہاری (تلمیذ مولانا مقبول احمد دربھنگوی تلمیذ مولانا برکات احمد ٹونکی) مطبوعہ اخلاق پریس بانکی پور

(۴) چہار تازیانہ قہار: مولانا معین الدین اجمیری، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی

(۵) کھلی چٹھی کا کھلا خط: مولانا معین الدین اجمیری، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی

(۶) حقیقت مناظرہ رامپور: مولانا محمد شریف اعظم گڑھی، مطبوعہ اکسیر اعظم پریس بنارس

(۷) التقریر الکامل فی تنبیه الغافل: مولانا محمد شریف اعظم گڑھی، مطبوعہ اکسیر اعظم پریس بنارس

(۸) الاعلان: مولانا محمد شریف اعظم گڑھی

(۹) الرباح الخطیة علی الصحیفة الملکوتیة: مولانا محمد شریف اعظم گڑھی

(۱۰) الطامۃ الکبریٰ: مولانا مقبول احمد خاں دربھنگوی مطبوعہ مطبع مجیبی پھلواری شریف

(۱۱) مناظرہ مور وسلیماں: مولانا محی الدین غازی اجمیری، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی

اسی درمیان تصفیے کی ایک صورت یہ پیدا ہوئی کہ مولانا عبدالوہاب صاحب مولانا اجمیری کے ساتھ مناظرے کے لیے آمادہ ہو گئے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ مناظرہ حیدرآباد میں ہو اور شیخ الاسلام مولانا انوار اللہ فاروقی حیدرآبادی صاحب اس کے حَکم ہوں وہ جو فیصلہ کر دیں اس کو فریقین تسلیم کریں، اس پر مولانا معین الدین اجمیری راضی ہو گئے، لکھتے ہیں:

اس دعوت کو فقیر بالرأس والعین قبول کرتا ہے، بہتر ہے حیدرآباد چلیے حضرت مولانا محمد انوار اللہ صاحب دامت برکاتہم کو ہم بھی حَکم تسلیم کرتے ہیں، اب آپ کو اس معاملے میں عجلت کرنا چاہیے، جس وقت روانگی کا ارادہ ہو فقیر کو بذریعہ تار مطلع فرمایئے، اور بہتر ہو کہ جناب براہ اجمیر شریف حیدرآباد تشریف لے جائیں تاکہ دونوں کا ساتھ ہو جائے، سفر کی منزلیں بخدا لطف کے ساتھ طے ہوں گی، الغرض فقیر ارشاد کی تعمیل کے لیے حاضر ہے-(۲۵)

مولانا کی اس تحریر میں دو باتیں خاص طور سے قابل غور ہیں ایک تو اس سے شیخ الاسلام مولانا انوار اللہ فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام ومرتبہ ظاہر ہوتا ہے، کہ آپ صرف منقولات ہی کے امام نہیں بلکہ معقولات میں بھی اس درجہ بلند مقام کے حامل تھے کہ منطق کے ایک الجھے ہوئے مسئلے کو حل کرنے کے لیے اگر فریقین کسی کے علم اور دیانت وامانت پر اعتبار کر کے فیصل اور حَکم ماننے پر آمادہ ہیں تو صرف آپ کی ذات گرامی ہے-

دوسرے اس عبارت سے مولانا معین الدین اجمیری کے خلوص اور کشادہ قلبی کا پتہ چلتا ہے کہ جس شخصیت سے آپ علمی میدان میں برسرِ پے کار ہیں اسی کو اس محبت کے ساتھ اپنا ہم سفر بنانے کی خواہش کر رہے ہیں گویا ان کے درمیان کوئی اختلاف ہی نہ ہو- یہ ہے علمی مباحثہ میں ہمارے اکابر واسلاف کا کردار-

قصہ مختصر یہ کہ حیدرآباد کے سفر کی نوبت ہی نہیں آئی اور اسی درمیان شمس العلما مولانا عبدالوہاب بہاری صاحب کا سانحہ ارتحال پیش آ گیا، ان کی اچانک وفات سے یہ معاملہ کسی فیصلہ کن موڑ پر پہنچنے سے پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچا-□□□

مراجع

(۱) باغی ہندوستان: از عبدالشاہد خاں شیروانی، ص ۱۸۴/۱۸۵، طبع پنجم ۲۰۰۱ء المجمع الاسلامی مبارک پور (۲) مرجع سابق ص ۱۸۴ (۳) مرجع سابق ص ۳۱۴
(۴) مرجع سابق ص ۱۹۶ (۵) مرجع سابق ص ۳۲۴
(۶) لواء الہدیٰ از علامہ غلام یحییٰ بہاری، ص ۹۴، مطبع نجم العلوم لکھنؤ ۱۳۱۱ھ
(۷) بحوالہ مصباح الدجیٰ ص ۱۹۵، مطبع نجم العلوم لکھنؤ ۱۳۱۱ھ
(۸) مرجع سابق، ص ۱۹۷

(۹) مرجع سابق، ص ۱۹۷،
(۱۰) تعلیق علی مصباح الدجی: مولانا عبدالحی فرنگی محلی، ۱۹۷،
(۱۱) مرجع سابق، ص ۱۹۷
(۱۲) تذکرہ علمائے ہند: از رحمان علی، ترجمہ ایوب قادری ص ۲۱۴ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء
(۱۳) تجلیات مہر انور: شاہ حسین گردیزی، ص ۲۱، مکتبہ مہریہ گولڑہ شریف پاکستان ۱۹۹۲ء
(۱۴) الظفر الحامدی: مولانا فضل حق رامپوری، ص ۳/۴ مطبع سعیدی رامپور ۱۳۲۳ھ
(۱۵) خلاصہ تقریظ ازاحۃ شبہات الشادی ص ۹۳ تا ۹۶ مطبع مفید عام لاہور ۱۳۲۵ھ
(۱۶) مولانا معین الدین اجمیری حیات ونظریات: مقالہ از: نجم الحسن خیرآبادی، مشمولہ "تلامذہ کا خراج عقیدت" مرتبہ حکیم محمود احمد برکاتی، ص ۵۳، برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۹۵ء
(۱۷) برصغیر کے علمائے معقولات اور ان کی تصانیف: مولانا عبدالسلام خاں رامپوری، ص ۷۷، خدا بخش لائبریری پٹنہ ۱۹۹۶ء
(۱۸) نقوش وتاثرات: مقالہ از مولانا محمد اسرائیل پشاوری، مشمولہ "تلامذہ کا خراج عقیدت" مرتبہ حکیم محمود احمد برکاتی، ص ۱۱۵/۱۱۶، برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۹۵ء
(۱۹) مولانا حکیم سید برکات احمد سیرت اور علوم: از حکیم محمود احمد برکاتی، ص ۹۱، برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۹۳ء
(۲۰) چہار تازیانہ قہار: از مولانا معین الدین اجمیری ص ۲، بحوالہ مولانا معین الدین اجمیری کردار وافکار: از حکیم محمود احمد برکاتی، ص ۶۵
(۲۱) مولانا معین الدین اجمیری کردار وافکار: حکیم محمود احمد برکاتی، ص ۶۴، برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۹۳ء
(۲۲) اخبار دبدبہ سکندری رامپور: شمارہ ۳۷، جلد ۵۳، ۲۴ رجولائی ۱۹۱۶ء، بحوالہ مولانا معین الدین اجمیری کردار وافکار: حکیم محمود احمد برکاتی، ص ۶۶/۶۷، برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۹۳ء
(۲۳) "الٹی پیرنا" ایک محاورہ ہے، یعنی کوئی کام دشواری اور وقت کے ساتھ انجام دینا۔
(۲۴) برصغیر کے علمائے معقولات اور ان کی تصانیف: مولانا عبدالسلام خاں رامپوری، ص ۶۱، خدا بخش لائبریری پٹنہ ۱۹۹۶ء
(۲۵) کھلی چٹھی کا کھلا خط: از مولانا معین الدین اجمیری، بحوالہ مولانا معین الدین اجمیری کردار وافکار: حکیم محمود احمد برکاتی، ص ۶۷/۶۸، برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۹۳ء

بقیہ: امریکہ نامہ

بھائی ماجد صاحب نے اپنی جانب سے ایک اور سبزی بھی کھلائی اور عمدہ چائے پلائی اور ہم سے بہت کم پیسے بھی لیے۔ جس تپاک سے ہمارے ایک پاکستانی بھائی ملے اسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے اور معاً خیال آیا کہ کاش ہم ہندستانی اور پاکستانی اسی طرح اپنے ملکوں میں بھی ملتے۔
نیویارک کی پہلی صبح ہمارے لیے اور بھی سردی لے کر آئی۔ لیکن ہم لوگ سیر کو نکل پڑے۔ ہر جگہ شہر کا میپ دستیاب تھا اور ٹرانسپورٹ کی رہنمائی بھی۔ اس لیے ہم ڈاکٹر رضوان جو تجربہ کار سیاح ہیں کی رہنمائی میں نکل پڑے۔ میٹرو کے ذریعے پہلے گراونڈ زیرو میموریل دیکھنے گیے۔ جو عمارت تباہ ہوئی تھی اس جگہ تعمیر کا کام تیزی سے جاری تھا اور نیا ٹریڈ سینٹر اسی کے بالمقابل نئی آب وتاب کے ساتھ پرانی عمارت سے بھی زیادہ اونچی اور مضبوط کب کی بن چکی ہے۔ یہ عمارت اسٹیل اور شیشے سے بنی ہوئی ہے۔ باقی کئی عمارتیں زیر تعمیر ہیں۔ اسے دیکھنے کے بعد ہم نے نیویارک کے کئی علاقوں کو دیکھا اور خاص طور پر اسٹیچو آف لیبرٹی کو۔ یہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ کس طرح سیاحوں کو اٹریکٹ کیا جاتا ہے۔ فیری (پانی کا جہاز) ہر آدھے گھنٹے پر مفت میں سیاحوں کو اس جزیرے کی سیر کراتی ہے جہاں اسٹیچو آف لیبرٹی ہے۔ انتہائی عمدہ انتظام، دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے اپنے عزیزوں کے لیے یہیں سے تحائف بھی خریدے۔ مجموعی طور پر نیویارک مشترکہ تہذیب وثقافت کا ایک خوب صورت شہر ہے اور اس کا امتیاز بھی یہی ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک کے لوگ اس شہر میں موجود ہیں۔ لیکن کم وقت میں تمام مقامات کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ ۱۳ ر اپریل کی صبح دہلی کے لیے ہماری واپسی تھی۔ دو دنوں میں اس شہر کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن اہم مقامات کو دیکھ کر 13 اپریل کو ہم لوگ دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ اس دفعہ امریکی وقت کے حساب سے ہمارا جہاز شام کے پانچ بجے نیویارک سے روانہ ہوا۔ کچھ ہی دیر میں رات ہوگئی۔ لیکن یہ رات صرف چار پانچ گھنٹے کی تھی۔ اس کے بعد تمام راستے دن ہی دن تھا۔ مگر سورج کی روشنی اتنی تیز تھی کہ ہم باہر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم خیر وخوبی سے 14 اپریل کی شام دہلی واپس آ گئے اور اب امریکہ کو نئے سرے سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ □□□

احمد جاوید☆

اور جب ''برج شاہی'' بولے گا

دبئی میں دنیا کی بلند ترین عمارت برج الخلیفہ کی تعمیر کے ابھی چند ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ جدہ سے خبر آئی کہ سعودی شاہی خاندان یہاں برج شاہی (کنگڈم ٹاور/ برج المملکۃ) کی تعمیر کرانے جا رہا ہے جو برج الخلیفہ سے تقریباً دوگنا بلند و بالا ہوگا تو میرے ذہن میں ایک مشہور حدیث کا مفہوم گردش کرنے لگا- جی ہاں! آپ نے بالکل درست سمجھا- قیامت سے پہلے ننگے پیر ننگے بدن رہنے والے چرواہوں کو دیکھو گے کہ بلند و بالا عمارتوں میں ان میں بازی لگی ہوئی ہے- صادق و مصدوق نبی پر ہمارا ایمان اور بھی تازہ ہو گیا- شاید آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج دنیائے عرب میں دولت و اقتدار جن ہاتھوں میں ہیں ان میں اکثریت کل کے چرواہوں (بدوؤں) کی ہے- مثل مشہور ہے کہ جس وقت روم جل رہا تھا اس کا بادشاہ نیرو بانسری بجا رہا تھا- آج دنیائے عرب کی جو حالت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، آپ چاہیں تو اس صورت حال کا موازنہ روم اور نیرو سے بھی کر سکتے ہیں لیکن میرے نزدیک مشرق وسطیٰ کی حالت دوسری تیسری صدی عیسوی کے روم سے کہیں زیادہ سنگین اور دھماکہ خیز ہے- یہ اور بات ہے کہ دنیا جس وقت قیامت کی چالیں چل رہی ہے، سلاطین عرب میں فلک شگاف عمارتوں کی بازی لگی ہوئی ہے-

بلند و بالا عمارتیں بنوانے کی روایت دنیا میں نئی نہیں ہے- اس کی تاریخ دنیا کی قدیم ترین تہذیب انسانی میں اہرام مصر کی شکل میں ملتی ہے لیکن یہ سلسلہ پچھلی صدی میں نئی شکل میں سامنے آیا جب امریکہ میں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ، سیئرس ٹاور اور ورلڈ ٹریڈ ٹاور کی عمارتیں وجود میں آئیں- موخر الذکر کو تو امریکی فخر سے جنت کی سیڑھی کہا کرتے تھے جو نائن الیون کے سانحہ کے ساتھ دنیا کی تاریخ کا ایک المناک ترین باب بن چکا ہے- مشرقی ممالک میں یہ رجحان دبئی کے برج العرب اور کوالالمپور کے پیٹروناس ٹاور کی تعمیر سے شروع ہوا- پچھلے سال برج الخلیفہ نے اب تک کی تمام فلک شگاف عمارتوں کو پیچھے چھوڑ دیا جس کی اونچائی 828 میٹر ہے- اس کے بعد تائیوان کے تاپے 101 (508 میٹر)، پھر شنگھائی (چین) کے ورلڈ فنانشیل ٹاور (492 میٹر) اور اس کے بعد ہانگ کانگ کے انٹرنیشنل کامرس سینٹر کی باری آتی ہے جب کہ چند سال پیشتر تک کوالالمپور (ملیشیا) کا پیٹروناس ٹاور (452 میٹر) دنیا کی بلند ترین عمارت تھا- یہ تفصیلات بتا رہی ہیں کہ آج فلک شگاف عمارتیں کس رفتار سے بن رہی ہیں اور مشرقی اقوام میں اس کی کیسی بازی لگی ہوئی ہے- جس دنیا میں ہر شب کروڑوں انسان بھوکے سوتے ہوں وہاں یہ عالی شان عمارتیں کیا بتا رہی ہیں، کس کی عظمتوں کا خطبہ پڑھ رہی ہیں، کس حقیقت کی آئینہ دار ہیں؟ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں جو یہ عمارتیں بنوا رہے ہیں، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ ان بلندیوں سے زمین پر رینگنے والے انسان یا تو چیونٹیوں سے بھی چھوٹے نظر آتے ہیں یا پھر نظر آتے ہی نہیں-

دبئی کے شاہی خاندان نے 828 میٹر بلند برج الخلیفہ کی تعمیر کرائی تو اس بلندی کو مات دینے کے لیے سعودی شاہی خاندان اس سے دوگنا بلند و بالا برج شاہی بنوا رہا ہے- جس وقت یہ خبر ہمارے کانوں میں پڑی میرے ایک صحافی دوست نے کہا دیکھنا یہ برج شاہی عنقریب ''برج رعایا'' بن جائے گا- لیکن میرے کانوں میں طرابلس کے صدارتی محل سے آنے والی یہ آواز گونج رہی تھی ''کیڑے مکوڑو، کاکروچو اور مینڈکو اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ ورنہ سب کے سب مارے جاؤ گے''- یہ کسی اور کی نہیں کرنل معمر قذافی کی آواز تھی جو اس وقت اس بلندی پر تھا جہاں سے خلق خدا نظر نہیں آتی یا آتی ہے تو کیڑے مکوڑوں سے بھی حقیر نظر آتی ہے-

30 ارب ڈالر کی لاگت سے بننے والا برج شاہی (کنگڈم ٹاور) ایک میل (1.6 کلومیٹر) بلند ہوگا- جدہ سے تقریباً 20 کلومیٹر کے فاصلے پر، بحر احمر کے ساحل پر واقع یہ بلند و بالا عمارت ایک کروڑ بیس لاکھ مربع فٹ کے وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوگی اور اس میں عالی شان ہوٹل، جم، ریسٹوران، اپارٹمنٹس اور دنیا بھر کی آسائشوں سے مزین شاپنگ سینٹرز ہوں گے- جس کی نچلی منزل سے آخری منزل کا سفر

☆Chief Editor, Hindustan Express, New Delhi-Email: ahmedjawed1970@yahoo.com

بذریعہ لفٹ 20 منٹ کا ہوگا- دبئی کے برج الخلیفہ کی بلندی 3281 فٹ ہے جب کہ جدہ کے برج شاہی کی بلندی 5,280 فٹ ہوگی- اس ٹاور کا ڈیزائن بھی اسی امریکی کمپنی نے تیار کیا ہے جس نے برج الخلیفہ کا ڈیزائن تیار کیا تھا- ماہرین تعمیرات اس منصوبہ کی تنقید کر رہے ہیں- ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی سب سے اونچی عمارت بنانے کی جو بازی لگی ہوئی ہے وہ خطرناک ہے- عالمی جریدہ دی آرکیٹیکٹس جرنل کے ایڈیٹر روزی آکاٹو نے اس کو فضول کی مقابلہ آرائی کہا ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ یہ بازی جو لگ گئی ہے تو کہنا مشکل ہے کہ کہاں جا کر ٹھہرے گی-

ہم نے بچپن میں پڑھا تھا: **المنارة تتحدث** (منارہ بولتا ہے)- یہ ساتویں جماعت میں عربی کی درسی کتاب القرأۃ الراشدہ کا پہلا سبق تھا- کتاب کے مؤلف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مضمون میں ہندوستان کی تاریخ بیان کی ہے- دہلی کا قطب مینار بچوں کو ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے عروج وزوال کی کہانی سنا رہا ہے- یہ کہانی بہت ہی دلچسپ، رقت انگیز اور عبرتناک ہے- دہلی کا قطب مینار بیان کر رہا ہے کہ کس طرح سرزمین ہند پر مسلمانوں کے قافلے اترے اور کس طاقت نے انہیں یہاں سرخ روئی وسربلندی عطا کی- پھر کیوں، کس طرح اور کن ہاتھوں سے وہ ذلیل وخوار ہوئے- انگریزوں کے ہاتھوں پلاسی اور بکسر کی جنگوں میں مسلمانوں کی شکستوں کی دلدوز کہانیاں سناتے وقت منارے کی آنکھیں بھر آتی ہیں- منارہ بتاتا ہے کہ جس وقت سلطنت مغلیہ کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا، ہندوستان کے ہندو مسلمان، راجے، مہاراجے، نوابین، جاگیرداران اور امرائے سلطنت کیا کر رہے تھے- کاش! آج کے یہ سلاطین مسلم سمجھ پاتے کہ منارے بھی بولتے ہیں اور بروج (ٹاورز) بھی کہانیاں سناتے ہیں- کاش! ان کے دل کی آنکھیں اندھی نہ ہوگئی ہوتیں اور یہ دیکھ پاتے کہ ان مناروں کی آنکھوں میں کس طرح خون کے آنسو تیر رہے ہیں، جو ان کے سروں پر کھڑے ہیں یا جن کی بلندیوں پر ان کے دماغ ہیں-

دنیائے عرب کی سیاسی وسماجی صورت حال تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہی ہے لیکن مشرق وسطی کے ملکوں کے حکمرانوں کی سمجھ سے باہر ہے کہ وہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر کیا کریں- صحرائے عرب میں تعمیر کیے جانے والے ان مناروں (ٹاورز) پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مغربی مبصر نے بڑی خدالگتی بات کہی ہے کہ یہ اس سوچ کی علامت ہیں جس کی جڑیں عہد وسطی میں پیوست ہیں- بلاشبہ یہ سلاطین عرب آج بھی عہد وسطی میں جی رہے ہیں- دنیائے عرب کو آج سیاسی، سماجی اور جغرافیائی اعتبار سے تین حصوں میں بانٹ کر دیکھا جاسکتا ہے- پہلا جزیرۃ العرب کا وہ علاقہ جہاں سعودی عرب، عراق، کویت، یمن اور عرب امارات ہیں، اس خطے میں انقلاب کی لہریں بہ ظاہر زیادہ طاقتور نظر نہیں آتی ہیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ یہاں زمینوں کے نیچے کتنا لاوا ابل رہا ہے- تیل کی دولت اور جبر واستبداد کی قوتوں سے دبی انقلابی طاقتیں کس دن آتش فشاں بن جائیں، کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن ان ملکوں کی دینی اور سیاسی قیادتیں یہ سمجھنے سے قاصر ہیں- دوسرے حصے میں دنیائے عرب کے قدیم تہذیبی وثقافتی مراکز واقع ہیں- مصر، شام، فلسطین اور اردن- اسی خطے میں دنیائے اسلام کا سب سے حساس فلیش پوائنٹ بیت المقدس اور صہیونیت کا ناسور اسرائیل ہے- عرب قوم پرستی کا میدان عمل شروع سے یہی خطہ رہا ہے اور یہاں نسبتاً زیادہ سیاسی بیداری ہے- تیسرا حصہ مغرب کا علاقہ ہے جو مراقش، لیبیا، تیونس، موریطانیہ اور شمالی افریقہ کے دوسرے ممالک پر مشتمل ہے- جہاں یوروپ اور صوفیہ کے اثرات کے باعث جمہوریت کی جڑیں اور انقلابی فکر کافی مضبوط ہیں اور آج ان دونوں خطے میں کس طرح حکمراں اور عوام آمنے سامنے کھڑے ہیں اور اس ٹکراؤ کا فائدہ اٹھانے کی کیسی سازشیں بیرونی طاقتیں کر رہی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں- کاش! ان حکمرانوں کی آنکھیں ہوتیں جو اس عالم میں بھی فلک شگاف عمارتوں کی تعمیر کی بازی میں لگے ہوئے ہیں- کاش! ان کے کان ہوتے وہ سن پاتے اور کاش! ان کے دل ہوتے جو یا در کھتے کہ منارے بھی بولتے ہیں-□□□

مولانا مجاہد رضا قادری☆

حافظ بخاری مولانا شاہ عبد الصمد چشتی سہسوانی

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

حافظ بخاری سیدنا شاہ عبد الصمد چشتی مودودی سہسوانی کا شمار برصغیر کی ان ممتاز شخصیات میں ہوتا ہے جن کی دینی اور روحانی خدمات کی ایک زریں اور تابناک تاریخ ہے، احقاق حق ابطال باطل ،ہدایت وارشاد، تصنیف وتالیف اور روحانی تزکیہ وتصفیہ کے ذریعے آپ نے دین وسنیت کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری مذہبی تاریخ کا ایک زریں باب ہے، تیرہویں صدی کے اواخر اور چودہویں صدی کے ربع اول میں آپ نے اسلام وسنیت کی خدمات کے سلسلہ میں قائدانہ کردار ادا کرتے ہوئے ہر سطح پر دینی خدمات انجام دیں، اس مضمون میں ہم آپ کی بعض اہم دینی خدمات کا مختصر جائزہ لے رہے ہیں۔

خاندان اور نسب: آپ قصبہ سہسوان (ضلع بدایوں) کے مشہور نقوی حسینی خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ ابو یوسف قطب الدین مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، اسی لیے آپ کے نام کے ساتھ ''مودودی'' بھی لکھا جاتا ہے۔ جون ۱۸۵۸ء میں آپ کے والد گرامی حضرت سید غالب حسین مودودی رحمۃ اللہ علیہ کو بغاوت کے الزام میں انگریزوں نے شہید کیا، اور تمام جائیداد واملاک ضبط کرلی۔

ولادت، تعلیم: آپ کی ولادت ۱۴/ شعبان ۱۲۶۹ھ-۱۸۵۳ء کو قصبہ سہسوان میں ہوئی، ۱۲۷۶ھ میں صرف سات سال کی عمر میں قرآن مجید کے حفظ سے فراغت پائی، اس کے بعد ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہی اپنے خالہ زاد بھائی مولانا حکیم سخاوت حسین صاحب سے حاصل کی، اعلیٰ تعلیم اور تکمیل کے لیے مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف تشریف لائے، سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی اور حضرت تاج الفحول مولانا شاہ عبد القادر محب رسول قادری بدایونی قدس سرہما سے تکمیل درسیات کی، جس وقت آپ نے مدرسہ قادریہ بدایوں شریف میں مروجہ درسیات کی تکمیل کی اس وقت آپ کی عمر محض ۱۴/ برس تھی۔

بیعت طریقت اور اجازت وخلافت: ۱۲۶۴ھ میں جب آپ کی عمر گیارہ سال کی تھی خیر آباد شریف (سیتاپور) میں شیخ المشائخ حافظ سید محمد اسلم چشتی خیر آبادی کے دست حق پرست پر سلسلہ چشتیہ نظامیہ فخریہ سلیمانیہ میں بیعت ہوئے۔ بعد میں شیخ محترم نے آپ کو تمام سلاسل طریقت کی اجازت وخلافت مرحمت فرمائی، آپ شیخ المشائخ حضرت حافظ اسلم خیر آبادی کے احب الخلفا تھے، آپ کی ذات سے سلسلہ چشتیہ سلیمانیہ کا خوب فروغ ہوا اور فیضان چشت اہل بہشت عام ہوا۔

اجازت حدیث: ۱۲۸۴ھ میں محدث مدینہ منورہ شیخ یوسف بن مبارک بن حمدون یمنی المدنی کی بارگاہ میں زانوے تلمذ تہ کیا اور تفسیر وحدیث کی بعض کتابیں پڑھیں، آپ کی صلاحیت، تقویٰ وپرہیز گاری اور خداداد ذہانت وفطانت سے آپ کے شیخ بہت متاثر ہوئے اور آپ کو دعاؤں کے ساتھ اجازت حدیث عطا فرما کر رخصت کیا۔

تصانیف: آپ نے تصانیف کا ایک قابل قدر ذخیرہ ملت اسلامیہ کی رہنمائی کے لیے چھوڑا، آپ کی تصانیف میں اکثر کتب کا تعلق باطل فرقوں کے رد وابطال سے ہے، آپ کے زمانے میں جو بھی اعتقادی یا فکری انحراف نظر آیا آپ نے اس کے خلاف قلمی جہاد فرمایا، تحقیق وتدقیق ،گہرائی وگیرائی اور سہل اسلوب بیان آپ کی تصانیف کا خاص وصف ہے ،آپ کی تصانیف اردو اور بعض فارسی زبان میں ہیں، بعض اہم تصانیف یہ ہیں: (۱) افادات صمدیہ رد شکوک واہیہ نجدیہ (۲) الطوارق الصمدیہ (۳) حق الیقین فی مبحث مولد اعلیٰ النبیین (۴) نصر المسلمین علیٰ عداۃ سید المرسلین (۵) نصر السنیین (۶) ارغام الشیاطین (۷) تبعید الشیاطین بامداد جنود الحق المبین (۸) جمع تلبیسات صواعق وغیرہ۔

وصال: ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں ۱۷/ جمادی الاخریٰ اور ۱۸/ جمادی الاخریٰ کی درمیانی شب میں وصال فرمایا، پھپھوند شریف میں ہی تدفین عمل میں آئی، آپ کا مزار آج بھی زیارت گاہ خاص وعام ہے اور مخلوق خدا فیض حاصل کرتی ہے، آپ کا عرس ہر سال ۱۷/۱۸/۱۹/ جمادی الاخریٰ کو احکامات شرعیہ کی پابندی کے ساتھ منعقد ہوتا ہے۔

اخلاف وجانشین: حضرت سید شاہ خواجہ مصباح الحسن مودودی

☆Madrasa Qadria,Molvi Mohalla,Budaun(U.P)

چشتی (ولادت:۱۳۰۴ھ-وفات:۱۳۸۴ھ) آپ کے فرزند گرامی تھے، آپ نے ابتدائی تعلیم مفتی ابراہیم فریدی قادری بدایونی، مولانا سید اخلاص حسین چشتی، اور حکیم مومن سجاد صاحب وغیرہ سے حاصل کی، معقولات کی تکمیل استاذ العلما علامہ ہدایت اللہ جونپوری (تلمیذ علامہ فضل حق خیر آبادی) سے اور دورۂ حدیث حضرت محدث سورتی کی درسگاہ میں مکمل کیا۔ بیعت واجازت والد گرامی حضرت حافظ بخاری سے حاصل تھی، حافظ بخاری کے بعد آپ ان کے جانشین ہوئے، ایک عالم کو آپ نے فیض یاب کیا۔

حافظ بخاری کی دینی خدمات: ہم یہاں اختصار کے ساتھ حافظ بخاری کی بعض دینی خدمات کا تذکرہ کریں گے، یوں تو آپ کی پوری حیات احقاق حق اور ابطال باطل میں گزری، لیکن خصوصیت کے ساتھ تین معاملات میں آپ کی خدمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں، ہم ان تینوں مسئلوں میں آپ کی خدمات کا قدرے تفصیلی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

امتناع نظیر کے مسئلہ پر مناظرہ: شاہ اسماعیل دہلوی کی کتاب تقویۃ الایمان نے جہاں بہت سے گمراہ عقائد ونظریات کو جنم دیا وہیں امتناع نظیر اور امکان کذب جیسے مسائل بھی اسی کتاب کی دین ہیں، شاہ صاحب نے تقویۃ الایمان میں ایک جگہ لکھ دیا کہ ''اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں حکم کن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن وفرشتہ جبریل اور محمد ﷺ کے برابر پیدا کر ڈالے'' (تقویۃ الایمان ص ۳۵) اس پر علامہ فضل حق خیر آبادی نے تحقیق الفتویٰ میں گرفت فرمائی کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی نظیر ممتنع بالذات ہے، اور اس قول سے کذب باری لازم آتا ہے، یہیں سے امکان کذب اور امتناع نظیر کے مسائل زیر بحث آئے، اس بحث کے دوران مولانا اسماعیل دہلوی کی حمایت کرنے والوں کی نظر اثر ابن عباس پر پڑگئی، لہٰذا یہ اثر بڑے زور شور سے اپنی دلیل میں پیش کیا جانے لگا، اثر ابن عباس کو حاکم وغیرہ نے اپنی کتب میں نقل کیا ہے، اثر ابن عباس کا ترجمہ یہ ہے کہ: حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سات آسمان پیدا فرمائے اور اسی طرح سات زمینوں کی تخلیق کی، ہر زمین میں تمہارے نبی کی طرح نبی ہے، آدم کی طرح آدم ہیں، نوح کی طرح نوح ہیں، ابراہیم کی طرح ابراہیم ہیں اور عیسیٰ کی طرح عیسیٰ ہیں علی نبینا وعلیہم السلام (المستدرک للحاکم: جلد۲، ص ۵۳۵)

اس حدیث سے حضور اکرم ﷺ کی نظیر کے نہ صرف امکان بلکہ موجود و متحقق ہونے کا عقیدہ بنا لیا گیا۔

مسئلہ امکان نظیر کے سلسلہ میں سب سے پہلے اثر ابن عباس کو میاں نذیر حسین دہلوی نے ۱۲۸۰ھ اور ۱۲۸۴ھ کے درمیانی عرصے میں پیش کیا۔ اس کے بعد میاں نذیر حسین دہلوی کے شاگرد میاں امیر حسن سہوانی نے ''افادات ترابیہ'' کے نام سے ۱۶ صفحات کا ایک رسالہ لکھا جو ان کے ایک شاگرد مولوی تراب علی خان پوری کے نام سے ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں میرٹھ سے شائع ہوا، اس رسالہ میں میاں امیر حسن سہوانی نے اثر ابن عباس کو بنیاد بناتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کے چھ امثال دیگر طبقات زمین میں بالفعل موجود و متحقق ہونے کا دعویٰ کیا، اس کے بعد سے ہی اثر ابن عباس کے تعلق سے بحث وتمحیص کا دروازہ کھلا۔ افادات ترابیہ کے جواب میں حافظ بخاری نے افادات صمدیہ تصنیف فرمائی، جس میں تحقیق سے آپ نے حضور اکرم ﷺ کی نظیر کا ممتنع ہونا ثابت کیا، اور اس اثر پر محدثانہ کلام فرماتے ہوئے تمام شکوک وشبہات کو رفع کر دیا۔ اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی ایوان باطل میں ایک زلزلہ آ گیا، ایک موقع پر اس سلسلے میں آپ کی گفتگو میاں امیر حسن سہوانی سے بھی ہوئی، یہ واقعہ ۱۲۸۶ھ کا ہے یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اس وقت حافظ بخاری کی عمر محض ۱۷ رسال تھی اور میاں امیر حسن سہوانی کی عمر ۴۳ ربرس تھی، اس کے باوجود جس عالمانہ وقار اور حاضر جوابی کے ساتھ آپ نے گفتگو فرمائی اس سے آپ کی ذہانت اور اعلیٰ علمی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، اس گفتگو میں آپ نے میاں امیر حسن صاحب کو لاجواب کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک مناظرہ ۱۲۸۸ھ میں حضرت تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی اور مولانا امیر حسن سہوانی (متوفی:۱۲۹۱ھ) کے درمیان قصبہ شیخوپور ضلع بدایوں میں ہوا، جس میں سہوانی صاحب کو شکست فاش ہوئی، اس کے اگلے سال ۱۲۸۹ھ میں ایک دوسرا مناظرہ تاج الفحول کے شاگرد رشید حضرت حافظ بخاری اور مولانا امیر حسن سہوانی کے صاحبزادے مولانا امیر احمد سہوانی (متوفی:۱۳۰۶ھ) کے درمیان خیر آباد ضلع سیتا پور میں ہوا جس میں امیر احمد سہوانی صاحب لاجواب ہوئے اور حافظ بخاری نے حق کا پرچم بلند کیا، اس مناظرے کی مفصل روداد مناظرۂ احمدیہ کے نام سے مولانا نعمان احمد خاں نے

مرتب کر کے مطبع الٰہی آگرہ سے طبع کروائی، وہیں سے اختصار و تلخیص کے ساتھ مناظرے کی مختصر روداد ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

حافظ بخاری: امتناع نظیر اور امکان نظیر کے مسئلہ میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟

مولانا امیر احمد سہوانی: میرا عقیدہ یہ ہے کہ وصف ختم نبوت میں ۶/آدمی رسول مقبول ﷺ کے مثل ۶/زمینوں میں موجود ہیں، مگر یہ مثلیت صرف وصف ختم نبوت میں ہے نہ کہ دوسری صفات کمالیہ میں۔

حافظ بخاری: مگر افادات ترابیہ میں تو لکھا ہے کہ سات مثل آنحضرت ﷺ کے ماہیت انسانیہ اور دیگر صفات کمالیہ میں موجود و محقق ہیں۔

مولانا امیر احمد سہوانی: افادات ترابیہ میری کتاب نہیں میرے شاگرد کی لکھی ہوئی ہے، اس کی خطا کا مواخذہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔

حافظ بخاری: حضرت میں نے افادات ترابیہ کو اس لیے پیش کیا کہ آپ نے اور آپ کے والد مولوی امیر حسن صاحب نے اس رسالے کو مشتہر کرنے میں بڑی سعی اور کوشش کی تھی، اس کے علاوہ آپ اس کے جملہ مضامین کو اپنے رسالے مناظرہ احمدیہ میں صحیح قرار دے چکے ہیں، اب الحمدللہ آپ نے تنزل تو فرمایا۔ ع۔ عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

حضرت آپ نے یہ عقیدہ کہاں سے مستنبط کیا؟

مولانا امیر احمد سہوانی نے حدیث سبع ارضین (اثر ابن عباس) پیش کی، اور فتح الباری کی عبارت پڑھی۔

حافظ بخاری: حدیث میں کاف تشبیہ آیا ہے اس میں ختم نبوت کی تخصیص جناب نے کس جگہ سے مستفاد فرمائی؟ اس کے علاوہ فتح الباری کی اس عبارت میں بیہقی کا مقولہ درج ہے، اور اس مقولے میں صحت اسناد کا ذکر ہے نہ کہ صحت حدیث کا، اور صحت اسناد کا قول صحت حدیث کو لازم نہیں، اس پر حافظ بخاری نے امام سیوطی کی تدریب الراوی کی عبارت دلیل میں پیش کی اور فرمایا کہ یہ وہ کتاب ہے جس سے آپ بھی سند لاتے ہیں اور امام سیوطی کے نقاد حدیث ہونے کے آپ کے اکابر بھی معترف ہیں۔

مولانا امیر احمد سہوانی: مفاتیح شرح مصابیح میں مذکور ہے کہ:

والمصنف المعتمد اذا اقتصر علیٰ انه صحیح الاسناد ولم یذکر له علة ولم یقدح فیه فالظاهر انه حکم بانه صحیح فی نفسه (ترجمہ: اگر معتمد مصنف صرف صحیح الاسناد کہنے پر اکتفا کرے اور کوئی علت نہ بیان کرے تو ظاہر یہ ہے کہ اس نے حدیث کے صحیح ہونے کا حکم لگایا ہے) لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ صحت اسناد صحت متن کو مستلزم ہوتی ہے۔

حافظ بخاری: اولاً اس عبارت سے ہر گز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ صحت اسناد کا قول قطعاً صحت متن کے قول کو مستلزم ہے، ثانیاً اس عبارت سے اور ہمارے زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے کہ جس قدر محدثین اس اثر کے ہیں کسی نے اس امر کی تصحیح نہیں کی ہے، اور اگر فرض کرلیا جائے کہ حاکم نے مستدرک میں اسناد کی تصحیح نہیں کی بلکہ حدیث کی کی ہے تو فقط حاکم کی تصحیح کا علمائے حدیث کے نزدیک کچھ اعتبار نہیں، (اس کے بعد آپ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی بستان المحدثین کی ایک عبارت پیش کی اس کے بعد فرمایا) بیہقی نے صحت اسناد کا حکم کیا مگر وہیں شذوذ حدیث کا بھی ذکر کردیا۔ تیسری بات یہ کہ تدریب الراوی میں امام سیوطی نے لکھا کہ شیخ الاسلام نے کہا کہ امام حدیث حدیث کی صحت کے قول سے صحت اسناد کے قول کی طرف اسی وقت عدول کرتا ہے جب اس میں شذوذ یا علت قادحہ ہو، لہٰذا شیخ الاسلام کے قول سے ثابت ہوا صحیح الاسناد کہنا اور صحیح المتن نہ کہنا بہ نسبت شذوذ یا علت قادحہ کے ہوا کرتا ہے۔

مولانا امیر احمد سہوانی: شیخ الاسلام مجہول ہیں ان کا قول قابل استناد نہیں۔

حافظ بخاری: اولاً میں نے ان سے استناد نہیں کیا ہاں جلال الدین سیوطی جن سے آپ بھی سند لاتے ہیں ان سے استناد کیا ہے، لہٰذا آپ کا یہ اعتراض خود آپ کے مستند پر ہے نہ کہ مجھ پر، دوسرے یہ کہ آپ صاحبوں کا عجیب حال ہے کہ جس عالم کا نام یا حال معلوم نہ ہو اس پر مجہول ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں، اور یہ خیال نہیں کرتے کہ جن کو آپ کے اکابر نقاد حدیث لکھتے ہیں وہ ان سے سند لاتے ہیں۔

مولانا امیر احمد سہوانی: زین الدین عراقی اور ابن صلاح نے لکھا ہے کہ جو حدیث فقط صحیح الاسناد بیان کی جائے اور اس میں کوئی شذوذ اور علت قادحہ نہ ہو وہ صحیح المتن بھی ہوا کرتی ہے، جیسے یہ حدیث۔

حافظ بخاری: اس حدیث کا حال یہ ہے کہ (۱) یہ قول غیر معصوم

ہے اور معصوم کے قول کے مخالف ہے (۲) اس میں عطا بن سائب ہیں اور ان کو امام نووی نے مقدمہ شرح مسلم میں مختلطین میں سے لکھا ہے (۳) جلال الدین سیوطی نے اس کے معنی میں تاویل کی ہے (۴) صاحب انسان العیون، صاحب مقاصد حسنہ اور صاحب ارشاد الساری نے مقدوح اور مردود ہونے کی تصریح کی ہے (۵) صاحب بحر محیط نے اس کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے (۶) بیہقی نے اس کے شاذ ہونے کو صاف لکھ دیا ہے کہ الا انہ شاذ بمرۃ (۷) اس کو صحیح فرض کرنے کے باوجود بھی وہابیہ کا مطلب اس سے ثابت نہیں ہوتا۔

مولانا امیر احمد سہوانی: (بیہقی کے لفظ ''بمرۃ'' میں الجھے اور کہا کہ) اس کے معنی ایک مرتبہ کے ہیں۔

حافظ بخاری: بمرۃ کے معنی بے شک اور بلاشبہ ایک مرتبہ کے ہیں، خود قسطلانی نے اس کو لکھ دیا ہے۔

مولانا امیر احمد سہوانی: قسطلانی قادح نہیں ہیں۔

حافظ بخاری: قسطلانی بیہقی کے اسی مقولے کے تحت ارشاد الساری میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ''اس میں یہ بات ہے کہ صحت اسناد سے صحت متن لازم نہیں آتی، جیسا کہ اس فن کے ماہرین کے نزدیک معروف ہے، کبھی اسناد تو صحیح ہوتی ہے مگر متن میں شذوذ یا علت قادحہ ہوتی ہے، اور پھر اس قسم کے مسائل (یعنی اعتقاد کے مسائل) حدیث ضعیف سے ثابت نہیں ہوتے''، اس کے علاوہ وہ خود صاحب ہدایہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ ''اخذہ من الاسرائیلیات'' یعنی حضرت ابن عباس نے یہ بات اسرائیلیات سے اخذ کی ہے۔

مولانا امیر احمد سہوانی: حضرت ابن عباس اسرائیلیات سے اخذ کیا ہی نہیں کرتے تھے۔

حافظ بخاری: یہ آپ ہی صاحبوں کی جرأت ہے کہ ایسے علمائے دین کو جھوٹا ٹھہراتے ہو، اور پھر اس سے قطع نظر عراقی نے شرح الفیہ میں اور امام نووی نے تہذیب میں حضرت ابن عباس کا کعب احبار سے اخذ کرنا لکھا ہے۔

مولانا امیر احمد سہوانی: صحیح بخاری میں تصریح ہے کہ حضرت ابن عباس اسرائیلیات سے اخذ نہیں کرتے تھے۔

حافظ بخاری: صحیح بخاری تو اس وقت یہاں موجود نہیں ہے، مگر فی الحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب شارح صحیح بخاری حضرت ابن عباس کا اسرائیلیات سے اخذ کرنا لکھتے ہیں تو وہ آپ سے زیادہ صحیح بخاری سمجھتے تھے۔ جب گفتگو میں طوالت ہوئی اور حاضرین مجلس اور صاحب مکان نے مجلس کو برخواست کرنا چاہا تو جناب ہادی علی خاں صاحب نے کہا کہ ''حضرت، ہم حدیث کو صحیح فرض کیے لیتے ہیں، کیا حدیث کی صحت فرض کرنے کے بعد یہ حدیث اس عقیدے کے لیے مفید ہے یا نہیں؟

مولانا امیر احمد سہوانی: عقائد غیر ضروریہ میں حدیث احاد بھی مقبول ہے۔

حافظ بخاری: کتب اصول میں صاف تصریح ہے کہ حدیث احاد مفید عقیدہ نہیں ہوتی، اس کے علاوہ مولوی نذیر حسین صاحب نے لکھا ہے کہ ''خبر عدل واحد مفید عقیدہ نمی شود''

مولانا امیر احمد سہوانی: مولوی نذیر حسین کیا ائمہ میں سے ہیں کہ جن کا قول مان ہی لیا جائے۔

حافظ بخاری: یہ حدیث صحاح میں بھی نہیں ہے، بلکہ ان کتابوں میں ہے جن کی نسبت آپ کے اکابر لکھتے ہیں کہ یہ کتابیں طبقہ ثالثہ اور طبقہ رابعہ میں داخل ہیں، اور طبقہ ثالثہ اور طبقہ رابعہ کی احادیث اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے کوئی عقیدہ یا عمل تمسک کیا جائے، ایسا ہی شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے (پھر آپ نے شاہ صاحب کی عبارت پڑھ کر سنائی) اس کے علاوہ وہابیوں کے رکن عظیم مولوی بشیر الدین قنوجی اپنی کتاب تفہیم المسائل میں لکھتے ہیں: ''احادیث کتاب ابن جریر از قسم احادیث کتب طبقہ رابعہ اند، واحادیث ایں طبقہ قابل اعتماد نیستند کہ در اثبات عقیدہ یا عملے بہ آنہا تمسک نمودہ شود'' (ترجمہ: ابن جریر کی کتاب کی احادیث طبقہ رابعہ کی احادیث کی قسم سے ہے، اور اس طبقے کی احادیث قابل اعتماد نہیں ہوتیں، کہ ان سے عقیدہ یا کسی عمل کے لیے تمسک کیا جائے)

یہ گفتگو یہیں ختم ہوگئی، اور مولانا امیر احمد صاحب کوئی معقول جواب نہ دے سکے، مناظرے کے عینی گواہ جناب محمد اعظم حسین صدیقی خیرآبادی لکھتے ہیں کہ ''مولوی امیر احمد صاحب نے یہ عبارتیں سنیں اور جلدی کچھ بھی جواب نہ دیا اس قدر شب کو گفتگو ہوئی، حق یہ ہے کہ مولوی امیر احمد صاحب نے ابتدائے گفتگو سے آخر تک خارج از مبحث باتیں پیش کیں''، اس کے بعد صبح کو حافظ بخاری نے ایک تحریر سہوانی صاحب کو ارسال کی، اس میں ان سے دو سوالات کیے، حافظ بخاری لکھتے ہیں:

شب کو جو مناظرہ مجھ سے اور آپ سے ہوا وہ ختم نہ ہو پایا، آخر میں مَیں نے بعد فرض صحت حدیث کے عبارت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولوی بشیر الدین صاحب کی پیش کی، اس کا جواب آپ کی طرف سے نہ دیا گیا، اب مَیں چاہتا ہوں کے اس کا جواب عنایت ہو، اور دو سوالات لکھتا ہوں ان کے جوابات شافیہ سے ممنون فرمایئے، اور ہر جواب میں استنباط علماے سابق کا منقول ہو اپنا استنباط زیب ترقیم نہ فرمایا جائے۔

سوال اول: یہ حدیث منقول حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہے، اس زمانے سے اب تک کسی قرن میں کسی عالم نے کسی تفسیر میں یا شروح حدیث میں یا عموماً کتب مستندہ میں کسی مقام پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے چھ مثل موجود و متحقق ہونے کا استنباط اس حدیث سے فرمایا ہے یا نہیں؟ اور بر تقدیر اول کوئی سند اس کی پیش کیجیے، اور اب تک استنباط نہیں کیا تو اس کی وجہ کیا ہے؟

سوال دوم: ایسی حدیث احاد کہ جس کی صحت میں گفتگو ہوئی ہے اگر بالفرض محال موافق آپ کے کہنے کے صحیح مان بھی لی جائے تو حدیث احاد سے استنباط عقیدہ کا کرنا اور ایسا عقیدہ کہ خلاف کلام اللہ و حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو جائز ہے یا نہیں؟ اور در صورت جواز سند کتب معتبرہ سے پیش کیجیے۔ حررہ السید عبدالصمد السہسوانی۔

سید عزیز احمد سہسوانی صاحب ان سوالات کو لے کر مولانا امیر احمد صاحب کے پاس گئے انہوں نے سوالوں کو اول سے آخر تک دیکھ کر کہا کہ ''میں جواب نہیں لکھتا''۔ اس طرح یہ مناظرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ (باختصار و تلخیص از مناظرۂ صمدیہ، ص۶ تا ۱۳)

تحریک ندوۃ العلما اور مجلس علماے اہل سنت: حافظ بخاری کی زندگی کی ایک اہم خدمت مجلس علماے اہل سنت کی صدارت بھی ہے، جس کے ذریعے آپ نے احقاق حق کا دینی فریضہ انجام دیا، یہ مجلس کن حالات میں قائم ہوئی؟ اس نے کیا خدمات انجام دیں؟ اور اس میں حافظ بخاری نے کیا کردار ادا کیا؟ یہ ایک بہت تفصیل طلب موضوع ہے، یہاں ہم اختصار کے ساتھ مجلس کے قیام کے پس منظر اور حافظ بخاری کی صدارت پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔

''۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کا سالانہ جلسۂ دستار بندی بڑے عظیم الشان پیمانے پر منعقد کیا گیا، اسی جلسہ میں مولانا محمد علی مونگیری نے ندوۃ العلما کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ ندوۃ العلما کے قیام کے دو بنیادی مقاصد بتائے گئے تھے ایک اتحاد بین المسلمین اور دوسرا اصلاح نصاب۔ ان دونوں مثبت اور تعمیری مقاصد کی وجہ سے اکثر علماے اہل سنت نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور ان ہی مقاصد کے تحت ندوۃ العلما کے قیام کی سنجیدہ کوششیں ہونے لگیں۔ اس وقت تک اکثر اکابر علماے اہل سنت اس تحریک میں شامل تھے۔ ندوۃ العلما کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا، جب ان اجلاسوں کی روودادیں شائع ہو کر آئیں تو علماے اہل سنت کو تشویش لاحق ہوئی کیوں کہ ان میں بعض چیزیں ایسی تھیں جو شرعی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں تھیں۔ دینی خیر خواہی کے پیش نظر علماے اہل سنت نے ندوہ میں در آنے والے ان مفاسد کی اصلاح کی کوششیں شروع کیں، ابتدا میں یہ کوششیں ذاتی ملاقاتوں اور افہام و تفہیم پر مبنی خط و کتابت تک محدود رہیں، لیکن جب حالات بہتر ہونے کی بجائے دن بدن بگڑتے گئے تو اصلاح ندوہ کی ان کوششوں نے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

شوال ۱۳۱۳ھ میں بریلی میں ندوۃ العلما کے اجلاس کا اعلان کیا گیا اور زور و شور سے اس کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ ادھر علماے اہل سنت نے بھی اصلاح احوال کی کوششیں تیز کر دیں۔ اس ضمن میں علماے اہل سنت کی ایک بڑی تعداد بریلی میں جمع ہو گئی۔ ندوہ کے تین روزہ اجلاس کے دوران گفت و شنید اور افہام و تفہیم، ذاتی ملاقاتوں اور مراسلت کے ذریعہ کی جاتی رہی مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا اور آخر کار ندوہ کا جلسہ ختم ہو گیا۔

مجلس علماے اہل سنت کا قیام ۔ ان ہی حالات میں بعض مخلص علما کو یہ خیال ہوا کہ اہل سنت کی ایک مجلس تشکیل دی جائے جو نظم و ضبط اور باقاعدگی کے ساتھ خلوص و للّٰہیت کی بنیادوں پر تحریر و تقریر کے ذریعے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ انجام دے، بریلی میں ندوہ کے اجلاس کے فوراً بعد شوال ۱۳۱۳ھ میں علماے اہل سنت کی ایک میٹنگ رضا مسجد محلہ سوداگران بریلی میں منعقد کی گئی جس میں حضرت تاج الفحول، حضرت فاضل بریلوی اور محدث سورتی جیسے اکابر وقت نے شرکت کی اور اسی میٹنگ میں ''مجلس علماے اہل سنت'' کے نام سے ایک تنظیم کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس مجلس کا صدر باتفاق رائے حضرت حافظ بخاری کو نامزد کیا گیا''۔ (تحقیق و تفہیم، ص:۵۸/۵۹) بقیہ صفحہ 37 پر دیکھیں

عصر حاضر میں مسلم نمائندہ نسل کی تعمیر کیسے ہو؟

نوٹ :- ماہنامہ "جام نور" اپنے اس کالم میں عصر حاضر کے کسی بھی مسئلہ کے تحت ہندوستان کے نامور علمائے کرام ودانشوران قوم و ملت سے ان کی تحریری رائے لیتا ہے- موصول ہونے والی آراء خواہ وہ مثبت یا منفی پہلو پر ہوں، شائع کی جاتی ہیں تاکہ متعلقہ مسئلے کے دونوں پہلو ارباب علم ونظر اور عام قارئین تک پہنچ سکیں اور متعلقہ مسئلہ پر علمائے کرام ودانشوران قوم کی تحقیقی وتجزیاتی رائے کی روشنی میں مسئلے کے صحیح نتائج برآمد ہو سکیں، علما ودانشوران کی سہولت کے پیش نظر مندرجہ بالا سوال سے متعلق چند ذیلی نکات بھی دیے گئے تھے، تاکہ مندرجہ ذیل خطوط پر دلائل وبراہین کے ساتھ وہ اپنا تحقیقی جواب دے سکیں.................... (ادارہ)

نکات

{1} نئی نسل کی تعمیر کسی بھی سماج اور ملت کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے؟

{2} مسلمانوں کی نئی نسل کی موجودہ تعمیر وتشکیل ان کے دینی وملی مستقبل کے لیے کس قدر اطمینان بخش ہے؟

{3} دینی اداروں اور عصری دانش گاہوں میں پروان چڑھ رہے مسلم نوجوانوں کی تعلیم وتربیت میں کن ضروری عناصر کا فقدان ہے؟

{4} مثالی مسلم سماج کی تشکیل کے لیے کس طرح کے مسلم جوان مطلوب ہیں اور ان کی تعمیر کن خطوط پر ہو؟

{5} عصر حاضر میں اسلام کی عالمی دعوت وتبلیغ اور مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے کس طرح کے دعاۃ ومبلغین اور سفرا درکار ہیں؟

"دینی اداروں میں عصری شعور کا فقدان ہے اور عصری اداروں میں دینی شعور کا- یہ ایسا خلا ہے جسے مسلم انٹلی جینس واضح طور پر محسوس کر رہی ہے، اس خلا کا پر کیا جانا عصر حاضر میں مسلم نمائندہ نسل کی تعمیر وتشکیل کی ضمانت ہے"

——— ذیشان احمد مصباحی☆

(۱) **جوان** نسل کسی بھی سماج کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے- ریڑھ کی ہڈی جسم کے درمیان میں ہوتی ہے اور اسی پر بالائی اور زیریں وجود قائم ہوتا ہے- اگر وہ مضبوط، مستحکم اور مستقیم ہے تو پورا جسم مضبوط، مستحکم اور مستقیم ہوتا ہے ورنہ قد جھک جاتا ہے اور جسم اپاہج بن جاتا ہے- ٹھیک اسی طرح جوان نسل سماج کی درمیانی نسل ہوتی ہے، اس سے اوپر بوڑھے ہوتے ہیں جو اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں، وہ تھکے ہارے ہوتے ہیں اور اپنی ساری امیدیں انہی جوانوں سے وابستہ رکھتے ہیں اور اس سے نیچے بچے ہوتے ہیں جو انہی جوانوں کو اپنا آئیڈیل بنا کر اپنا تعلیمی وتربیتی سفر طے کرتے ہیں- جوان نسل علم وفکر اور سیاست وبصیرت کے اعتبار سے بھی قوم کی نمائندہ ہوتی ہے اور جسمانی طاقت، فوجی قوت اور سیاسی استحکام کے لیے بھی وہی بنیاد ہوتی ہے- اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی بھی سماج میں جوانوں کی کیا اہمیت ہے-

سماج کے بوڑھوں کو جوان نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ہی بے راہ وبے کار جوانوں کو رہبر ورہنما اور باکار بنایا سکتا ہے- ایسے میں صرف نوجوان اور بچے بلفظ دیگر نسل نو ہی ایسی ہے جس کی بہتر تعلیم وتربیت کے ذریعے اسے خود کار، پرعزم، مدبر اور قائدانہ وامیرانہ صلاحیتوں کا حامل بنایا جا سکتا ہے- نئی نسل کی اچھی تعلیم وتربیت سے ہی قوم کی نمائندہ نسل کی تعمیر وتشکیل ہو سکتی ہے اور اسی کے توسط سے ہی کسی بھی قوم کے بہتر مستقبل کا خواب سجایا جا سکتا ہے- اگر نئی نسل کی تعمیر وتشکیل صالح خطوط پر نہ کی گئی تو پھر سماج میں بے کار اور اوباش جوانوں کی کثرت ہوگی جو قومی اور ملی تباہی کا الارم ہے-

مسلمانوں کی نئی نسل کی موجودہ تعمیر وتشکیل ان کے دینی وملی کے مستقبل کے لیے امید افزا ضرور ہے لیکن اطمینان بخش نہیں ہے- امید افزا اس

☆zishanmisbahi@gmail.com

لیے کہ دینی اور ملی سطح پر پسپائی کا ایک مبہم احساس تقریباً آج کے ہر مسلمان کے اندر پیدا ہو چکا ہے اور کسی بھی قوم کے اندر اس احساس کا پیدا ہونا اس کی ترقی کی راہ کا پہلا زینہ ہے کیوں کہ جرم کا اعتراف خیر کے دروازے کھولتا ہے اور اسی طرح زوال کا ادراک عروج کی راہیں ہموار کرتا ہے- اس اعتبار سے مسلمانوں کی نئی نسل کی تعمیر و تشکیل خواہ جس طور پر ہو امید افزا اس لیے ہے کہ ایک چنگاری ہر نوجوان کے سینے میں سلگ رہی ہے جو کبھی بھی شعلہ بن کر اپنی راہ خود متعین کر سکتی ہے- چوں کہ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ بہتا ہوا پانی اپنی راہ خود بنا لیتا ہے اس لیے کاروان مسلم کے دل میں پیدا شدہ یہ احساس زیاں دیر یا سویر متاع کارواں کی بازیافت از خود کر لے گا-

دوسری طرف مسلمانوں کی نئی نسل کی موجودہ تعمیر و تشکیل کے ناقابل اطمینان ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قومی و ملی تعمیر کے تین مدارج ہوتے ہیں (۱) تفکیر (۲) تدبیر اور (۳) تعمیل- اور مسلمان اب تک تفکیری مرحلے کو بھی عبور نہیں کر سکے ہیں- مسلم اشرافیہ فکری انتشار بلکہ فکری دیوالیہ پن کا شکار ہے- ۱۶ ا رویں صدی مغربی دنیا کی نشاۃ ثانیہ اور مسلم دنیا کے زوال کا نقطۂ آغاز ہے- اس وقت سے اب تک پچھلے چار سو سالوں میں تسلسل کے ساتھ مسلمان مذہبی اور سیاسی ہر دو سطح پر پسپا ہوتے آ رہے ہیں- ابتدائی دو صدیوں میں تو وہ احمقوں کی جنت میں جیتے رہے جب ان کی آنکھ کھلی تو سب کچھ لٹ چکا تھا، جب کہ آخری دو صدیاں عظمت رفتہ کو یاد کرنے اور دل بہلانے میں بسر ہو گئیں- اس دوران مسلمان اپنی شکست کو چھپانے کے لیے یہ کہتے رہے کہ مغرب کی جدید ترقی مسلمانوں کی دین ہے- اب اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ مسلم نفسیات میں یہ احساس گھر کرتا جا رہا ہے کہ یاد ماضی سوائے عذاب کے کچھ بھی نہیں ہے، مستقبل کی سرفرازی کے لیے ہمیں اپنے حال میں جد و جہد کرنا ضروری ہے- لیکن بدقسمتی سے حال میں جد و جہد کس انداز کی ہو اس کے خطوط واضح طور پر سامنے نہیں آ سکے ہیں- مغرب کی سازش ہے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو Devide & Rule یہ بات پچھلے سو سالوں سے شد و مد کے ساتھ دہرائی جا رہی ہے لیکن اس سازش کو ناکام کیسے بنایا جائے، مسلم ذہن اس کا حل اب تک دریافت نہیں کر سکا ہے- ایسے غیر یقینی اور پر آشوب ماحول میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ نئی نسل کی تعمیر و تشکیل قابل اطمینان ہو- اس اجمال کی قدرے تفصیل یہ ہے:

(الف) تقریباً نصف سے زائد مسلم بچے ابتدائی تعلیم و تربیت سے محروم ہیں- ان بچوں پر کچھ تبصرہ کرنا ہی بے کار ہے- یہ ایک کرب ہے کاش مسلم اشرافیہ اس کا احساس کرے اور اسلامی نظام زکوۃ کے عملی نفاذ کے ذریعے اس کا مداوا تلاش کرنے کی فکر کرے-

(ب) زیر تعلیم مسلم بچوں اور نوجوانوں کی اکثریت سرکاری اسکولوں اور تیسرے درجے کے پرائیویٹ اسکولوں میں ہے- ایسے طلبہ دینی تعلیم و تربیت سے تقریباً محروم ہیں- ان سے مسلمانوں کے دینی مستقبل کی امیدیں وابستہ کرنا محض عبث ہے اور ملی مستقبل کی توقع بھی تقریباً فضول ہے- بہت زیادہ یہ ہوگا کہ یہ بچے جوان ہو کر بے روزگار نہیں رہیں گے دوسرے اور تیسرے درجے کی کسی نہ کسی ملازمت سے وابستہ ہو جائیں گے-

(ج) زیر تعلیم بچوں اور نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد وہ ہے جو دینی مدارس میں ہے جہاں دینی تعلیم اس معیار کی نہیں ہے کہ اس کے توسط سے اسلام کے عالمی سفیر اور دعاۃ و مبلغین پیدا ہوں، اسلام پر جدید اعتراضات اور سوالات کرنے والوں کا شافی جواب دینے والا دستہ تیار ہو اور اس تعلیم سے مسلم اقتصادی و سیاسی پسماندگی کے حل کی توقع تو کی ہی نہیں جا سکتی- اس کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مقامی سطح کا دینی شعور پیدا ہوتا ہے اور اسی میں سے استثنائی طور پر بعض آفاقی دینی شعور کی مثالیں بھی نکل آتی ہیں- لیکن اصولی اعتبار سے مستثنیات پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا- مدارس کی تعلیم کے بارے میں آخری طور پر صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے- Something is better than no thing.

(د) زیر تعلیم مسلم بچوں اور نوجوانوں کی قلیل تعداد اعلیٰ سطحی پرائیویٹ اسکولوں میں ہے- ان کا معاشی اور جدید معاشرتی مستقبل محفوظ ہے- لیکن کیا ایسے بچوں سے مسلمانوں کے دین و ملت کے مستقبل کی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں؟ شاید نہیں اور قطعاً نہیں! ہمیں تو اس بات کی فکر اور دعا کرنی چاہیے کہ ایسے بچوں اور نوجوانوں کی موت ہی اسلام پر ہو جائے- اگر یہ بھی ہو جاتا ہے تو بہت غنیمت ہے- چہ جائیکہ یہ نسل بڑی ہو کر مسلمانوں کے دینی و ملی استحکام کا سبب بنے-

(۳) دینی اداروں میں عصری شعور کا فقدان ہے اور عصری اداروں میں دینی شعور کا- یہ ایسا خلا ہے جسے مسلم انٹلی جینسیا واضح طور پر محسوس کر رہی ہے- اس خلا کا پر کیا جانا عصر حاضر میں مسلم نمائندہ نسل کی تعمیر و تشکیل کی ضمانت ہے- اس بنیادی کمی کے علاوہ بھی ایسے کئی ضروری عناصر ہیں

جن کا دینی وعصری اداروں میں فقدان ہے مثلاً دینی اداروں کا حال یہ ہے کہ
(الف) دینی اداروں میں قرآن، حدیث، فقہ اور سیرت کے علوم پڑھائے جاتے ہیں مگر ان اداروں میں ایسی تربیت کا فقدان ہے جس سے
ان علوم کو دل میں اتارا جائے۔ بلفظ دیگر دینی ادارے عالم بنانے کا کام کر رہے ہیں عامل بنانے کا کام نہیں کر رہے ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے عمل
کے بغیر کوئی بظاہر کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو وہ در حقیقت جاہل ہے۔
(ب) دینی اداروں میں طلبہ کے اندر جو نفسیات پیدا ہوتی ہے اس میں اصلاح کے بالمقابل افساد اور اتحاد کے بالمقابل اختلاف کے عناصر
زیادہ ہوتے ہیں۔ دینی ادارے داعی اور مبلغ پیدا کرنے کے بجائے بالعموم مقرر اور مناظر پیدا کر رہے ہیں۔
(ج) دینی مدارس میں مسالک اور فرقوں کے بارے میں تو معلومات فراہم کرادی جاتی ہے اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ مسلکی تصلب
بسا اوقات اسلامی حمیت پر غالب آجاتا ہے، مگر دوسری طرف مذاہب واقوام کی معلومات فراہم نہیں کی جاتی۔ نتیجے کے طور پر فارغین مدارس کی فکری
جدوجہد کا محور صرف مسلکی مسائل ہوتے ہیں ملی، بین مذاہبی اور بین اقوامی مسائل پر ان کی نظر نہیں ہوتی یا بہت کم ہوتی ہے۔
اسی طرح عصری ادروں میں پروان چڑھ رہے طلبہ کی تعلیم وتربیت میں کئی ضروری عناصر کا فقدان ہے، مثلاً
(الف) مارکس کے فارمولوں کے مطابق عصری دانش گاہوں میں زیر تعلیم طلبہ معاشی حیوان بنتے جا رہے ہیں۔ صرف مذہبی نہیں انسانی اقدار
بھی بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس فکر میں جی رہے طلبہ جب جدید مذہبی دنیا کی ''مذہبی تجارت'' کو دیکھتے ہیں تو وہ اپنی خودسری اور بے راہ روی میں
اور پختہ اور جری بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے طلبہ کے سامنے عصری اداروں کے اندر یا باہر مذہب کے نام پر جی رہے لوگوں میں ''مثالیت'' نظر نہیں
آتی۔ سماج میں مخلص اور صحیح معنوں میں مذہبی افراد کا فقدان اس معاشی حیوانیت کو مزید تقویت فراہم کر رہا ہے۔
(ب) عصری اداروں میں جو طلبہ مذہب پسند واقع ہیں، جو بالعموم سائنس کے طلبہ ہیں، ان کی رہنمائی صحیح ڈھنگ سے نہیں ہو پا رہی ہے۔
مختلف فرقوں اور مسالک سے وابستہ افراد ان طلبہ کی مذہبیت کا استحصال کر رہے ہیں۔ ایک بڑا طبقہ وہ ہے جو ان طلبہ کو اسلامی رواداری اور عالم
گیریت کے اسباق پڑھانے کے بجائے تشدد اور نفرت کے اسباق پڑھا رہا ہے۔ اگر ان طلبہ کی صحیح اسلامی متصوفانہ تربیت ہوتی ہے تو یقینی طور پر ان
طلبہ سے مسلمانوں کے بہتر سیاسی، سماجی، علمی، تعلیمی اور ملی مستقبل کی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔
(ج) عصری اداروں میں اسلام پڑھانے والے اساتذہ بالعموم ''مثالی مسلمان'' نہیں ہیں۔ علمی وفکری طور پر بھی ان کے اندر وہ استحکام نہیں
ہے جو ہونا چاہیے۔ اسلامی ماخذ ومصادر پر بھی ان کی گرفت مضبوط نہیں ہے۔ وہ مستشرقین کی چبائی ہوئی ہڈیاں چوستے ہیں اور مگن رہتے ہیں۔ اس
سے عصری اداروں میں اعلیٰ دینی تعلیم بہت متاثر ہے اور اس کے منفی اثرات یہاں زیر تعلیم اسلامیات کے طلبہ اور دیگر طلبہ پر مرتب ہوتے ہیں۔
(۴) مثالی مسلم سماج کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے جب اس میں ایسے جوان ہوں جو سو فیصد مسلمان ہوں اور سو فیصد اکیسویں صدی کے
انسان ہوں۔ ان کا دل مسائل کتاب وسنت سے معمور ہو اور ان کی عقل جدید طرز حیات کے ہر ہر پہلو سے واقف ہو۔ ان کے ہاتھوں میں ہدایت کا
قرآنی چراغ ہو اور ان کے پیروں تلے ان کی تعمیر کردہ شاہراہ ہو۔ ان کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے دین بھی ہو اور دنیا بھی ہو۔ دین ودنیا کسی
بھی جہت سے کمزور جوان مثالی مسلم سماج کی تشکیل نہیں کر سکتے۔
ایسے جوانوں کی تعمیر بخاری ومسلم میں وارد حدیث جبرئیل کی روشنی میں بہتر طور پر کی جا سکتی ہے۔ یہ حدیث اللہ پر، رسولوں پر، آخرت پر، بعث
بعد الموت پر، آسمانی کتابوں پر، فرشتوں پر اور قیامت کے دن پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتی ہے۔ نیز اسلام کے پانچ ارکان (۱) کلمہ شہادت (۲)
نماز (۳) روزہ (۴) زکوٰۃ (۵) حج کی نشاندہی کرتی ہے۔ مثالی مسلم سماج اسی وقت تشکیل پا سکتی ہے جب اس کے جوان ان ارکان پر پوری
ایمانداری سے عامل ہوں۔ ایمان ان کے دل کی گہرائی میں اترا ہوا ہو اور وہ ارکان اسلام کے پابند ہوں۔ پھر اس حدیث میں ''احسان'' کی تعلیم
فرمائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ عبادت اس طور پر کرو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو یا اس طور پر کرو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مومن کی
زندگی کا ہر حصہ اگر وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے تو وہ عبادت ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مسلم جوان زندگی کے جس شعبے سے وابستہ ہوں وہاں

خدا کو حاضر و ناظر سمجھیں اور پوری ایمانداری کے ساتھ اپنا کام احسن طریقے پر کریں۔ خواہ مسجد میں ہوں کہ تعلیم گاہ میں، تجارت میں ہوں کہ ملازمت میں، ادب کے بازار میں ہوں کہ سائنس کی لیباریٹری میں، جہاں ہوں اپنی ذمہ داریاں "احسان" کی روشنی میں احسن طریقے پر انجام دیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ مثالی مسلم معاشرہ تشکیل نہ پائے۔

(۵) عصر حاضر میں اسلام کی عالمی دعوت و تبلیغ اور مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے ایسے دعاۃ و مبلغین اور سفرا مطلوب ہیں جو دینی علوم اور جدید علوم سے پورے طور پر آراستہ ہوں۔ ان کی نظر سماجیات، تاریخ، فلسفہ، عمرانیات، سیاسیات، اقتصادیات، جدید سائنسی علوم، جدید تکنالوجی اور اکتشافات پر گہری ہو۔ جدید دور میں اسلام کا داعی و مبلغ اور سفیر بننا آسان نہیں ہے، اس کے لیے باعزم نوجوانوں میں سے کچھ کو خالص اللہ و رسول کی رضا جوئی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنی ہوں گی۔ اس کے ساتھ انہیں اخلاص، للہیت، ایمان راسخ، تحمل کامل، تواضع اور راست بازی کے زیور سے بھی آراستہ ہونا ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ پیش کش کے جدید ذرائع اور تکنیک سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ ان صلاحیتوں اور خوبیوں سے لیس اگر مسلم جوان سامنے آتے ہیں تو اکیسویں صدی میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کار عظیم و جلیل بہتر انداز میں انجام پائے گا۔ یہی جوان اسلام اور مسلمانوں کے نمائندہ ثابت ہوں گے اور اکیسویں صدی کو وہ سب کچھ دینے کے اہل ہوں گے جس کی اس صدی کو شدید ضرورت ہے۔□□□

> **"نمائندہ نسلوں کی تعمیر ایسے خطوط پر ہو کہ اگر وہ مدارس سے ہوں تو ان میں دین و ملت کی خدمت کا جذبہ ہو اور اگر وہ عصری اداروں سے ہوں تو ان میں یہ احساس ہو کہ معاش کے ساتھ دین و ملت کی بھی ان پر کچھ ذمہ داریاں ہیں"**
> ——— **ضیاء الرحمن علیمی**☆

ہر زمانے میں نئی نسل کی تعمیر کسی بھی سماج اور ملت کے لیے بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے اور ہر دور میں نئی نسل کی تعمیر و تشکیل پر توجہ دی گئی ہے، اس کی وجہ صرف یہ رہی کہ زمان و مکان کی تفریق کے بغیر نمائندہ نئی نسل کی ضرورت اور اہمیت محسوس کی گئی، کسی بھی قوم کی بقا اور ترقی نئی نسل کی تعمیر و تشکیل کے ساتھ جڑی رہی، چنانچہ جس سماج نے کامیابی کے ساتھ نئی نسل کی تعمیر و تشکیل کا فریضہ انجام دیا وہ ترقی کی منزلیں طے کرکے بام عروج تک پہنچ گیا۔ نئی نسل اور اس کی تعمیر و تشکیل کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہر زبان میں نئی نسل کے متعلق مختلف محاورے اور مقولے وجود میں آئے۔ چنانچہ عربی زبان میں کہا گیا شباب امة بذور مستقبلها اور یہ بھی کہا گیا "اشبال اليوم مستقبل الغد" یہ سارے محاورے اور مقولے بھی اسی بات کو واضح کرتے ہیں کہ نئی نسل اور اس کی تعمیر و تشکیل کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

نئی نسل کی اسی اہمیت کے مدنظر مسلمانوں نے بھی نئی نسل کی تعمیر و تشکیل کا فریضہ بخوبی انجام دیا اور اسی کے ذریعہ ان کے بھی عہد زریں کا آغاز ہوا، اور وہ دنیا کی امامت و قیادت کا منصب سنبھال سکے اور عصر حاضر میں اگر مسلمانوں کی پسماندگی اور تنزلی کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو ایک بڑا سبب ان خصوصیات و امتیازات پر موجودہ دور میں نئی نسل کی تعمیر و تشکیل نہ ہونا ہے جو کبھی مسلم نمائندہ نسل کا خاصہ ہوا کرتے تھے۔ آج مسلمان، مذہب اسلام اور ملت اسلامیہ اپنے دور انحطاط سے گزر رہی ہے۔ موجودہ دور میں نئی نسل کی تعمیر و تشکیل ان کے دین و مستقبل کے لیے اطمینان بخش نہیں ہے۔

جب ہم نئی نسل کا لفظ بولتے ہیں تو اس وقت ہمارے ذہن میں تین طرح کے افراد ہوتے ہیں ایک وہ نسل جو مدارس میں پروان چڑھ رہی ہے، دوسری وہ نسل جو عصری دانش گاہوں میں تعلیم کے مرحلے سے گزر رہی ہے، اور تیسری وہ نسل جس نے مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد عصری دانش گاہوں کا رخ کیا اور اس وقت ان عصری دانش گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہے۔

اب اگر تینوں نسلوں کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ یہ چلے گا کہ اولاً تو مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کا تناسب ہی مسلمانوں کی ضرورت کے لحاظ سے کم ہے، دوسری طرف جو طلبہ ان مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کا بیک گراؤنڈ اتنا کمزور ہے اور وہ سماج کے اتنے کمزور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ان سے مسلمانوں کا نمائندہ نسل بن کر سامنے آنے کی توقع نہیں کی جانی چاہیے اور تیسری طرف معاملہ یہ ہے کم از کم اگر صرف ہندوستانی سطح پر مدارس اسلامیہ کا جائزہ لے لیا جائے تو یہ تلخ حقیقت سامنے آئے گی کہ ہندوستان میں تعلیمی اداروں کے نام پر مدارس کی ایک لمبی فہرست

☆mzralimi@gmail.com

ہے لیکن جو ادارے صحیح معنوں میں تعلیم دے رہے ہیں ان کو ہم انگلیوں پر شمار کر سکتے ہیں اور پھر جن اداروں میں تعلیم ہو رہی ہے ان میں بھی اکثر جگہوں پر مختلف اسباب کی وجہ سے تربیت کا فقدان ہے۔

روز اول سے ہی عصری دانش گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی صورت حال اس سے بھی بدتر ہے۔ وہ عصری دانش گاہوں میں تعلیم حاصل کر کے معاشی حیوان تو بنتے جا رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ انسانی اقدار اور اسلامی تعلیمات سے اسی قدر دور ہوتے جا رہے ہیں اور تقریباً اسی طرح کی صورت حال ان طلبہ کی بھی ہوتے جا رہی ہے جو مدارس اسلامیہ سے فارغ ہو کر عصری دانش گاہوں کا رخ کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ موجودہ دور میں نئی نسل کی موجودہ تعمیر و تشکیل ان کے دین و ملت کے مستقبل کے لیے اطمینان بخش نہیں ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ دینی اداروں اور عصری دانش گاہوں میں پروان چڑھ رہے مسلم نوجوانوں کی تعلیم و تربیت میں کن ضروری عناصر کا فقدان ہے؟ تو اس سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ نئی نسل کی نمائندگی کرنے والی ان تینوں نسلوں میں سب سے اہم عنصر جو مفقود ہے وہ یہ ہے کہ یہ تینوں نسلیں تربیت سے عاری ہیں، مدارس اسلامیہ کے طلبہ اسلامی علوم سے تو آراستہ ہیں لیکن اسلامی اصولوں پر ان کی تربیت نہیں ہو سکی ہے اور اسی وجہ سے وہ فراغت حاصل کرنے کے بعد بھی اپنا واضح ہدف متعین نہیں کر پاتے۔

اسلام اور سنیت کا واضح تصور ان کے اندر موجود نہیں ہوتا بلکہ اسلام اور سنیت دونوں سے ان کا تعلق رسمی سا ہوتا ہے۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس بہت کم ہی ہوتا ہے بلکہ خود وہ علوم جن کو انھوں نے حاصل کیا ہے اس پر بھی ان کا گہرا ایمان و اعتماد نہیں ہوتا۔ دوسری طرف جو نسل عصری دانش گاہوں میں اپنے روز و شب گزار رہی ہے اس کا حال یہ ہے کہ اسے صرف یہ بات معلوم ہے کہ وہ ایک خاص تعلیم اس لیے حاصل کر رہی ہے تاکہ وہ یہ تعلیم حاصل کر کے معاشی طور پر مستحکم ہو جائے اور ایک خوش حال زندگی گزار سکے، اس کے آگے اسے کچھ نہیں معلوم۔ اسلامی اصولوں پر ان کی بھی تربیت نہیں ہو سکی ہے اور اس کے لیے والدین اور دوسرے متعلقین ذمہ دار ہیں۔ تیسری جانب جو نسل مدارس سے فارغ ہو کر عصری دانش گاہوں کی طرف متوجہ ہوئی اس کا حال یہ رہا کہ اولاً ان کی یہ ہجرت کسی باضابطہ منصوبے، متعین اہداف اور مشفقانہ سرپرستی کے تحت نہیں ہوئی اور عموی طور پر صورت حال یہ رہی کہ جس کو بھی مدارس کی تعلیم سے نفرت ہوئی وہ عصری دانش گاہوں کی طرف چل پڑا، یا پھر کسی طالب علم کا کوئی دوست اس سے پہلے یونیورسٹی کی طرف گیا اور وہاں پہنچ کر اس نے تھوڑے دن تعلیم حاصل کرنے کے بعد اچھی معاش حاصل کر لی تو اب اس طالب علم نے بھی اچھی معاش حاصل کرنے کے لیے اسی یونیورسٹی کی طرف رخت سفر باندھ لیا یا پھر تقلیدی طور پر بغیر کسی ہدف و مقصد کے یونیورسٹی کی طرف نکل پڑے یعنی جس طرح مختلف میدان عمل میں لامرکزیت اور لامقصدیت کا دور دورہ ہے اسی طرح عصری دانش گاہوں میں زیر تعلیم طلبہ بھی لامرکزیت، لامقصدیت اور لاقانونیت کا شکار ہیں۔

اوپر جتنی باتیں کہی گئی ہیں وہ عمومی لحاظ سے ہیں، استثنا ہر جگہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ ادھر پچھلے چند سالوں سے نئی نسل کی نمائندگی کرنے والی تینوں نسلوں میں بیداری آئی ہے اور انھیں اپنی ذمہ داریوں کے تعلق سے احساس و شعور پیدا ہوا ہے، مدارس کے طلبہ کو یہ احساس ہو چلا ہے کہ مدرسے میں جو تعلیم انہوں نے حاصل کی ہے گہرے ایمان کے حصول کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے، اور اپنی اس تشنگی کو دور کرنے کے لیے وہ سرگرداں نظر آ رہے ہیں۔ جو نسل عصری دانش گاہوں میں روز اول سے ہی تعلیم حاصل کر رہی ہے وہ اب اپنی جڑوں کو تلاش کرنے لگی ہے، اس کی فکر اسلامی اور اس کی روح اسلامی ہوتی جا رہی ہے اور وہ حق کی جستجو میں لگی ہوئی ہے اور جو نسل مدرسے کی تعلیم سے آراستہ ہو کر عصری دانش گاہوں میں مصروف تعلیم ہے وہ آہستہ آہستہ اپنے اہداف متعین کرنے کی کوشش کرنے لگی ہے اور میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت کی حامل یہی آخری نسل ہے کیوں کہ یہ نسل اپنی صلاحیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ مسلم نمائندہ نسل بننے کی قوت رکھتی ہے، یہی نسل روز اول سے عصری دانش گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والی نسل کی تربیت کرے گی اور اس کو اپنے اپنے میدان عمل میں رہ کر اسلام کی نمائندگی کا طریقہ سکھائے گی، یہی نسل مدارس میں تعلیم حاصل کر چکی یا تعلیم حاصل کر رہی نسل کو آفاق کی پہنائیوں سے واقف کرائے گی، اس کی سوچ میں ہمہ گیریت پیدا کرے گی اور اسے اس کی حقیقی اہمیت سے روشناس کرائے گی اور اسلامی تعلیم اور عصری تعلیم کے مابین قائم گہری خلیج کو کم کر کے باہمی استفادے کی راہ ہموار کرے گی ـــــ بقیہ صفحہ 39 پر دیکھیں

اظہارِ خیالات

اس کالم میں آپ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی اور ملی کسی بھی مسئلہ پر اپنی فکر اور اپنے خیال کا برملا اظہار اور بے لاگ تبصرہ کر سکتے ہیں جو ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جائے گا، واضح ہو کہ اس سلسلے میں آپ کی تحریر مختصر اور جامع ہونی چاہیے............(ادارہ)

مخلصانہ اپیل

حضرت سید نجیب حیدر قادری
نائب سجادہ نشین: خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ شریف، ضلع ایٹہ (یوپی)

آج کے اس مادی دور میں عام طور سے لوگوں نے اپنا طرز زندگی مکمل طور سے بدل دیا ہے جو ہماری اسلامی تہذیب سے مطابقت نہیں رکھتا، خود غرضی اور خود پسندی لوگوں کا شیوہ ہوتا جا رہا ہے- سماجی بے راہ روی عام ہو رہی ہے- دینی حمیت مردہ ہو رہی ہے- شعائر دین سے لوگ نا آشنا بلکہ دور ہوتے جا رہے ہیں- اس کی جگہ دنیاداری آگئی، دولت جمع کرنے میں لوگ راحت محسوس کرتے ہیں، دینی تعلیم حاصل کرنا محض ایک رسم ہوتی جا رہی ہے- بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو اپنے بچوں کے لیے دینی تعلیمات کا انتظام کرتے ہیں ورنہ اکثر لوگ اس سے بے گانگی کا اظہار کرنا فخر سمجھتے ہیں، دینی تعلیمات سے بیزاری میں اپنی شان تصور کرتے ہیں- نئی نسل دینی تعلیمات سے بڑی تیزی سے دور ہوتی جا رہی ہے-

ان حالات کے پیش نظر فقیر برکاتی نے یہ ارادہ کیا کہ وہ اہل سنت وجماعت کے افراد کو احساس دلائے کہ وہ اپنی نئی نسل کو سنبھالنے کے لیے کمر بستہ ہوں اور اپنے بچوں کے لیے دینی تعلیمات اور اسلامی معلومات کا انتظام اپنے گھروں میں کریں- بلکہ اس کے لیے ایک پورا ماحول پیدا کریں جس میں نئی نسل کی پرورش و پرداخت دینی طور پر ہو- اس کے لیے ہم نے ایک تدبیر سوچی ہے کہ والدین اپنی سطح پر، اپنی مالی حیثیت کے مطابق اپنے گھر میں دینی کتب کی ایک لائبریری قائم کریں جس میں اپنے عقائد ونظریات کے حوالے سے قرآن وحدیث سے ثابت شدہ مسائل کا ذخیرہ ہو، بلکہ وہ دلائل ہم خود یاد کریں اور اپنے بچوں کو یاد کرائیں جن سے بدمذہبوں کا رد بلیغ ہو سکے- آج کل ہندوستان میں نت نئے فتنے جنم لے رہے ہیں اور سب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قرآن وسنت کے عین مطابق ہیں اور اپنے عقائد ونظریات کے ثبوت میں حدیثوں کا حوالہ دیتے ہیں جب کہ ان کے خلاف موقف کی تائید جن احادیث سے ہوتی ہے ان سے چشم پوشی کر کے لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہے-

لہٰذا، فقیر برکاتی یہ گزارش کرتا ہے کہ کم از کم ایک مذہبی کتاب ہر ماہ ضرور خریدیں، اور اپنے گھر میں اسلامی لائبریری کے قیام کی بنیاد ڈالیں- اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے- (آمین)

صنعت تکثیر کی توضیح

علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی
شیخ الحدیث: دار العلوم نور الحق، چرہ محمد پور، فیض آباد (یوپی)

دور دراز مقام سے سفر کر کے چند احباب میرے پاس تشریف لائے اور کتاب "غرائب الجمل" مرتبہ "شمس العلما نواب عزیز جنگ والا" سے حضرت والا القاب مولانا عبد الجلیل صاحب بلگرامی کے ان اشعار کو پیش کر کے ان کا حل دریافت فرمایا، جنہیں انہوں نے تقریب جلوس محمد شاہ غازی کے لیے بطور خراج تحسین منظوم تہنیت میں لکھا ہے- ان ہی اشعار کے ضمن میں مادہ تاریخ جلوس محمد شاہ غازی بھی ایک بیت میں رقم کیا ہے جو صنعت تکثیر پر مشتمل ہے یعنی بظاہر مادۂ تاریخ ایک بیت ہے، لیکن اگر اسے صنعت تکثیر کے مخصوص ضابطے کے تحت تحلیل کیا جائے تو بہت سارے اشعار پیدا ہو سکتے ہیں- وہ شعر یہ ہے:

شہ عادل، مہ کامل، یم سائل، جم والا ۱۱۴۰ بدل دانا، بید داما، بجود اوئی، بجد اوفی

۷۷۸ ۳۶۲

پھر اس شعر کے محاسن کو بیان فرمایا ہے اور اس سے پہلے یہ بھی لکھا ہے کہ

برآید چل ہزار و سہ صد ابیات لطیف از وی — برآں مجموع بست افزوں کن و دریاب ایں مضمر

یعنی اس مادۂ تاریخ والے شعر سے (۴۰۳۲۰) ابیات برآمد ہوتے ہیں اور ہر بیت مدح سلطان اور تاریخ جلوس پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بالا شعر سے (۴۰۳۲۰) ابیات نکالنے کے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر خواہی کہ استخراج ایں اعداد دریابی — بہ برہاں می کنم خاطر نشین طبع دانشور
بود ترکیب ایں طرب افروز ہشت ارکاں — کہ در ارکان او ممکن بود تقدیم یک دیگر
پس از رکن سوم نسبت ہر دو شش صور گردد — کہ از ضرب سہ در دو بے تکلف شش بود اظہر
دریں شش باز چوں رکن چہارم را بضرب آری — برآید بست ابیات و چہار افزوں برو بنگر
بریں منوال گر امکان باقی را بما قبلش — بضرب آری بایں اعداد می شود منجر

ہم نے جواباً عرض کیا، شعر مذکور کی وضاحت ملاحظہ کرنے سے پہلے ۳ر مقدمات ذہن نشین کر لیں۔

(۱) تاریخی مادے کے اس بیت میں علم عروض کے اعتبار سے ۸ر مرتبہ مفاعیلن آیا ہے یعنی اس کے ۸ر ارکان ہیں۔

(۲) ہر رکن کے ہم وزن الفاظ جو بیت میں واقع ہیں سبھی سالم الحال ہیں یعنی ایسا نہیں کہ کوئی لفظ ٹکڑا ہو کر کچھ اس رکن میں اور کچھ دوسرے رکن میں شامل ہو جائے

(۳) مفاعیلن کے وزن پر جتنے الفاظ بیت میں مذکور ہیں وہ سبھی مدح پر مشتمل اور مرکب توصیفی ہیں۔

ان مقدمات ثلثہ سے واضح ہو گیا کہ بیت میں مذکور ارکان کو اگر مقدم و مؤخر کر دیا جائے تو نہ اس سے وزن میں فرق آئے گا اور نہ ہی مدح میں کسی قسم کا قدح پیدا ہوگا مثلاً اگر مصرعہ اولیٰ کو بدل کر یوں کہیں۔ مہ کامل یم سائل جم والا شہ عادل

تو اس تبدیلی مقام سے وزن میں کوئی فرق نہیں آیا اور نہ ہی مدح میں کوئی کمی آئی، یہی حال مصرعۂ ثانیہ کا ہے، اسی طرح اگر پورے بیت جس میں ۸ر ارکان ہیں، ان آٹھوں ارکان میں تبدیلی مقام کریں جب بھی وزن شعری مادہ تاریخی اور مدح و ثنا میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

مگر مسئلہ یہ ہے کہ ان ارکان کی تقدیم و تاخیر سے (۴۰۳۲۰) صورتیں کیسے پیدا ہوں گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ علمائے ریاضی نے بتایا ہے کہ کسی مرکب میں گنتی کے اعتبار سے جتنے ارکان شامل ہوں ان کی گنتی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک کو دوسرے میں ضرب دیتے جائیں تو آخری ضرب سے جو حاصل ہوگا ارکان کی تقدیم و تاخیر سے اتنی ہی صورتیں اس مرکب میں پیدا ہوں گی خواہ وہ اعداد سے مرکب ہو جیسے (۴۳۲) یا حروف سے جیسے (ناس) یا چند مرکبات سے مرکب ہو جیسے (شعر مبحوث عنہ)

اسے یوں سمجھیں کہ (۴۳۲) میں گنتی کے لحاظ سے ۳ر ارکان ہیں یعنی ۱ر۲، ۲ر۳، ۳ر۴، تو چونکہ نفس ارکان کو نہیں بلکہ ارکان کو شمار کرنے سے جو گنتی برآمد ہوتی ہے اس گنتی کو ایک سے لے کر آخری گنتی تک ضرب دینا ہے۔ لہٰذا اسے اس طرح (۱x۲x۳) ضرب دیں تو حاصل ضرب (۶) آئے گا یعنی یہ حاصل ضرب بتاتا ہے کہ ان ارکان کو مقدم و مؤخر کرنے سے کل ۶ آئے گا یعنی یہ حاصل ضرب بتاتا ہے کہ ان ارکان کو مقدم و مؤخر کرنے سے کل ۶ر صورتیں ہی پیدا ہوں گی اور وہ صورتیں یہ ہیں (۴۳۲-۴۲۳-۳۴۲-۳۲۴-۲۳۴-۲۴۳) اسی طرح ''ناس'' میں حروف مختلف ۳ر ارکان ہیں (ن، ا اور س) اگر ان تینوں رکنوں میں الٹ پھیر کریں تو بھی ۶ر یہی صورتیں پیدا ہوں گی کیوں کہ (۱x۲x۳) کا حاصل (۶) ہی آتا ہے اور وہ صورتیں یہ ہیں (ناس، نسا، انس، اسن (عمر دراز، سنا، (ایک دوا نام (شان (استرہ میں دھار پیدا کرنے کا آلہ)۔

کتاب میں مذکورہ بیت ۸ر ارکان پر مشتمل ہے، یعنی شہ عادل، مہ کامل، یم سائل، جم والا، بدل دانا، بید داما، بجود اوئی، بجد اوفی، اسے ہم اس

طرح (۸x۷x۶x۵x۴x۳x۲x۱) ضرب دیں تو حاصل ضرب (۴۰۳۲۰) آئے گا یعنی ان ارکان کی تقدیم وتاخیر سے (۴۰۳۲۰) ابیات ہوں گے، ہر بیت وزن شعری کے اعتبار سے صحیح اور مدح پر مشتمل ہوگا اور ہر ایک بیت میں چوں کہ وہی الفاظ ہوں گے جو اصل شعر میں ہیں اس لیے تمام ابیات سے مادۂ تاریخ بھی برآمد ہوگا۔صنعت ہذا میں خصائص مذکورہ کا حامل بندۂ ناچیز کا بھی ایک شعر ملاحظہ کریں لیکن بلحاظ ابجد العلوم سے جو عدد حاصل ہو رہا ہے، وہ کسی کا مادہ تاریخ نہیں ہے:

شہ والا، قد بالا، گل لالہ، برخ ہالہ ۵۰۴۵ جگر پتھر، بدن شیشہ، نظر خنجر، جفا پیشہ

نوٹ: یہ قاعدہ انہی مرکبات میں جاری ہوگا جن کے ارکان مختلف ہوں جیسے امثلۂ مذکورہ اور اگر ارکان مختلف نہ ہوں تو بلحاظ گنتی حاصل ضرب معلوم ہو جانے پر کتنی ہی الٹ پھیر کریں وہ اسی صورت پر رہے گا، جیسے (۴۴۴)۔

جام نور اتحاد اہل سنت کے لیے کام کر رہا ہے

سید صادق انواری اشرفی
کامل الحدیث: جامعہ نظامیہ، حیدرآباد (اے پی)

محترمی مولانا خوشتر نورانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ...... بعد سلام مسنون عرض تحریر یہ ہے کہ پچھلے کئی سال سے ملت کے خاص اور جدید نظریات والے ترجمان ''جام نور'' کی شہرت وتعریف سن رہا تھا، لیکن کبھی نظر نواز نہ ہو سکا، اتفاق سے میرے ایک محب عزیزم محمد حنیف رضوی نگارچی ساکن بیجاپور کرناٹک نے ماہ اکتوبر ونومبر ۲۰۰۷ء کے حالات حاضرہ کالم میں مولانا ذیشان احمد مصباحی کا تحریر کیا ہوا مضمون ''دعوت وتبلیغ کی راہیں مسدود کیوں؟'' کی پہلی اور دوسری قسط کا زیراکس پیش کیا، مصباحی صاحب کے اس مضمون کے مطالعہ کے بعد یہ شوق ہوا کہ جام نور کے مشمولات سے استفادہ کروں، اس لیے الحمدللہ! فروری ۲۰۰۸ء سے بحیثیت ممبر ہر ماہ ماہنامہ جام نور دہلی کا منتظر رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے جام نور اور اس کے تمام احباب کو ہر قسم کے اختلافات اور نظر بد سے محفوظ رکھے اور اس کے ذریعے سارے عالم کے سینوں کو ہمیشہ اپنے علم وعرفان کو منور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

۶/۵ مارچ ۲۰۱۱ء کو انٹرنیشنل محدث اعظم کانفرنس میں شرکت ہوئی، پہلے دن اسٹیج پر بیٹھنے کا موقع ملا، لیکن خانوادۂ اشرفیہ کے معزز حضرات کے علاوہ آپ سے اور حسان پاکستان حضرت سید صبیح الدین صبیح رحمانی صاحب سے ملاقات اور مصافحہ کرنا چاہتا تھا، لیکن صرف صبیح رحمانی صاحب کی دست بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ پہلے اور دوسرے دن منتظمین حضرات کا پہرا بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے صرف شرف دیدار ہی نصیب ہوا۔ جدید نثر ونظم نگاروں میں مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری صاحب اور سید صبیح الدین صبیح رحمانی سے متاثر ہوں اور صبیح رحمانی صاحب کی لکھی نعتیں جلسوں اور محفلوں میں پڑھتا اور سنتا ہوں۔ مولانا اسید الحق کی تحریری صلاحیت اور ان کی خامہ تلاشی کی وجہ سے ابھی تک جام نور سے تحریری رابطہ نہیں ہو سکا، پھر بھی آج جرأت کر کے ان الفاظ کو ضبط تحریر کر رہا ہوں۔ تحقیق وتفہیم، خامہ تلاشی کے علاوہ ان کے کئی مضامین خاص طور پر ''تقریروں میں موضوع روایات: ایک لمحہ فکریہ'' پڑھ چکا ہوں۔ آخر الذکر مضمون کو دوست واحباب میں جو علما ومقررین ہیں زیراکس کروا کر ان میں تقسیم کیا گیا۔ اس خط کو لکھ ہی رہا تھا کہ مئی ۲۰۱۱ء کا جام نور بھی آ گیا۔ جام نور کی خاص بات یہ ہے کہ ہندوستان کے دیگر علما ومشائخ کے ساتھ جنوبی ہند کے علما ومشائخ کا تذکرہ بھی ہوتا ہے، جب کہ دیگر رسائل وجرائد میں یہ بات نظر نہیں آتی، اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جام نور صحیح معنوں میں سواد اعظم اہل سنت و جماعت کا نمائندہ رسالہ ہے، جو بنام اہل سنت پورے برصغیر میں اتحاد اور تعمیری ورک کے لیے کوشاں ہے۔

جام نور کے خصوصی شمارہ ''محدث اعظم ہند: حیات، افکار، کارنامے'' میں مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری صاحب کے مضمون کی کمی حد درجہ محسوس کی گئی، شاید مصروفیات کی وجہ سے وہ نہ لکھ سکے ہوں۔ اخیر میں میری جانب سے جام نور سے وابستہ تمام احباب وقارئین کو سلام پیش ہے اور گزارش ہے کہ حضرت سید صبیح الدین صبیح رحمانی صاحب، مولانا اسید الحق صاحب اور مولانا ذیشان احمد مصباحی سے رابطے کے لیے ان کے پتے اور فون نمبر سے آگاہ فرمائیں۔

محدث اعظم نمبر کی اشاعت پر دلی مبارک باد!

محمد عرفان قادری

استاذ: مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن، شاہی مسجد، بڑا چاند گنج لکھنؤ (یوپی)

مکرمی مولانا خوشتر نورانی صاحب! ہدیۂ تسلیمات...... امید کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے- محدث اعظم ہند علامہ سید محمد اشرفی کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی حیات وخدمات اور افکار وکارنامے پر مشتمل ''ماہنامہ جام نور'' اپریل ۲۰۱۱ء کا خصوصی شمارہ فردوس نگاہ بنا- اداریہ سمیت شمارہ کے دیگر مشمولات کا میں نے بغور مطالعہ کیا، علم وتدبر سے مالا مال مشاہیر اصحاب قلم اور ارباب فکر ودانش نے محدث اعظم ہند کی حیات مبارکہ کے ان اہم و قابل ذکر گوشوں کو اجاگر کیا ہے جو ابھی تک باقاعدہ طور پر منظر عام پر نہیں آئے تھے- اس شمارہ کے پڑھنے کے بعد حضور محدث اعظم کی شخصیت ایک ایسے مخلص دینی پیشوا وملی رہنما کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتی ہے، جنہوں نے اپنی پوری زندگی خدمت دین اور مسلک اہل سنت کی ترویج واشاعت کے لیے وقف کر رکھی تھی- آپ کے آفاقی کارناموں سے واقفیت کے لیے یہ شمارہ ان شاء اللہ نئی نسل کے لیے سنگ میل ثابت ہوگا-

ادارتی صفحہ پر تقسیم کار سے متعلق جو باتیں آپ نے لکھی ہیں ان سے انکار کی گنجائش نہیں- یہ تقسیم کار کے فقدان کا ہی نتیجہ ہے کہ حکومتی سطح پر جماعت اہل سنت کی خاطر خواہ نمائندگی نہیں ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے- اساطین دین وملت کو جس کا شدید احساس بھی ہے لیکن اس کے باوجود بھی نہ معلوم کس بنا پر ہمارے دینی وملی رہنما پسماندگی کے خول سے باہر نکلنا نہیں چاہتے- ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے یہاں باصلاحیت لوگوں کی کمی ہو- اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ نے فروغ سنیت کے لیے جو دس نکاتی فارمولہ مرتب فرمایا تھا، جہاں تک میرا اپنا خیال ہے اس فارمولے پر مکمل طور پر غیر اہل سنت نے عمل کیا- یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہر میدان میں قابل وذی استعداد افراد موجود ہیں اور حکومت بھی انہی کو مسلمانوں کا لیڈر تسلیم کرتی ہے- آخر میں خالص علمی وفکری اس وقیع وضخیم شمارہ کی اشاعت پر میں ماہنامہ جام نور کے تمام اراکین بالخصوص آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ رب العزت اس رسالہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے-

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست!

سید محمد حیدر ربانی

المجمع الاسلامی، ملت نگر مبارک پور (اعظم گڑھ)

محترم مدیر اعلیٰ ماہنامہ جام نور! تسلیمات...... عین حالت انتظار میں مئی ۲۰۱۱ء کا شمارہ موصول ہوا- پہلے تو آپ ''محدث اعظم ہند نمبر'' کی اشاعت پر ڈھیر ساری مبارک باد قبول فرمائیں- بلاشبہ اکابر کی حیات وخدمات سے نئی نسل کو متعارف کرانا جماعت کا دینی وملی فریضہ ہے- اس اہم پیش کش پر آپ پوری جماعت کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں- بہر کیف! مئی کے شمارے میں مولانا اسید الحق کا سفر نامہ طویل ہونے کے باوجود ہمیں پسند آیا- ذیشان مصباحی نے رضویات کے پس منظر وپیش منظر پر روشنی ڈالنے کی اچھی کوشش کی ہے، بر سبیل تذکرہ چند ایسے امور کی نشان دہی بھی کی ہے کہ جو سچ ہونے کے ساتھ ساتھ تلخ بھی ہیں- مولانا صغیر اختر مصباحی کا مضمون ''نئی بوتل میں پرانی شراب'' کے مصداق ہے، جلسے کے تعلق سے موصوف نے کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے- ''تذکار'' کے کالم میں ڈاکٹر مفتی مکرم صاحب نے پروفیسر مسعود احمد مجددی کی کچھ یادیں قلم بند کی ہیں، اس سے پہلے پروفیسر صاحب ہی کے تعلق سے ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی کا مضمون شائع ہوا تھا، زیر نظر مضمون کو پڑھنے کے بعد حیرت ہوئی کہ یا اللہ! دونوں ڈاکٹر صاحبان کے انداز فکر میں کتنا عظیم فرق ہے- شرر صاحب کے مضمون سے بار ہا یہ احساس جنم لیتا ہے کہ پروفیسر صاحب سے جو بھی فروگزاشتیں ہوئیں، ان کی حیات کا سب سے قابل ذکر یہی گوشہ ہے کہ جس کے لیے صفحات کے صفحات سیاہ کرنے پڑے اور ان کی گوناگوں، علمی وتحقیقی خدمات جن کا ایک جہاں قائل ہے وہ سرسری بیان کر جانے کے لائق ہیں، اب یہاں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ: فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

مضمون کے آخری اقتباس سے اندازہ ہوا کہ اگر نکتہ چینی ہی کو ذخیرۂ آخرت نہ بنایا جائے تو انسان بہت کچھ کر سکتا ہے- مولانا اسید الحق کے متنازع مضمون پر اس بار ازہار احمد امجدی نے خامہ فرسائی کی ہے- گو امجدی صاحب سے مولانا کو سمجھنے میں ذرا چوک ہوئی ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں

نے اطلبو العلم ولو بالصین کو حدیث رسول ثابت کرنے کی دھمکی بھی دی ہے جسے مولانا اسید الحق صاحب موضوع روایات کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں- اب دیکھنا یہ ہے کہ کب وہ اس وعدے کو عملی جامہ پہناتے ہیں اور کب وہ مضمون ہماری زینت نگاہ بنتا ہے، ویسے مذکورہ حدیث پر جام نور میں اور مولانا کی پیش کردہ دوسری روایات پر ماہ نامہ کنزالایمان دہلی میں مولانا رضوان احمد شریفی کا قسط وار مضمون دیکھنے کو ملا، ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے، موصوف نے کئی ایک احادیث کا تجزیہ کر کے ان کا صحیح یا حسن ہونا ثابت کیا ہے، اب دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، بہر کیف! رسالے کے تمام مشمولات، وقیع اور معیاری ہیں، ہم دست بدعا ہیں کہ جام نور اسی طرح خوب سے خوب تر کی تلاش میں گامزن رہے-

عصری جامعات میں زیر تعلیم طلبۂ مدارس اور جام نور کا موقف؟

محمد ناصر رام پوری

ایم، اے عربی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

محترمی! سلام مسنون...... ماہنامہ جام نور کا موجودہ شمارہ نظر سے گزرا- استفسار کا کالم ہم جیسے نو عمر قارئین کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے- میں تقریباً ہر مرتبہ استفسار کا کالم بھی توجہ سے پڑھتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے کئی مرتبہ کئی باتیں سیکھنے کو ملی ہیں- موجودہ شمارے میں ایک مستفسر طالب علم کے سوال پر بھی گفتگو کی گئی ہے- سائل کے سامنے کئی چیزوں کی وضاحت کی گئی ہے اور کئی چیزوں کی خود سائل سے بھی وضاحت طلب کی گئی ہے- تحریر میں یہ تشویش بجا ہے کہ بہت سے متعلمین تاخیر سے بھی تعیین ہدف نہیں کر پاتے اور یہ نصیحت بھی درست ہے کہ کوئی فیصلہ جنون کے تحت نہیں بلکہ شعور کے تحت ہونا چاہیے- کل ملا کر جواب بہتر ہے- البتہ جزوی طور پر ہمیں ایک دو جگہ ایسا لگا کہ اپنی تشویش ظاہر کریں- مثلاً اس بات سے کہ ''اکثر طلبہ یونیورسٹی میں پہنچ کر بے سمتی، بے راہ روی یا احساس محرومی کا شکار ہو رہے ہیں'' اتفاق مشکل ہے- یہ سچ ہے کہ یہ سخت جدو جہد، محنت و مشقت اور صبر و استقلال کا متقاضی زمانہ ہوتا ہے مگر کم از کم اکثر طلبۂ مشقتوں کے ماحول میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ بہتر نتیجہ نکلے گا، پھر دھیرے دھیرے یہ یقین صورت واقع بھی بنتا جا رہا ہے- پھر عصری اداروں میں پڑھ رہے فضلائے مدارس پر کوئی الزام دیتے وقت ہمیں مدارس سے فراغت کے بعد عصری جامعات کی طرف متوجہ کرنے والے فضلا کے درمیان بھی مطمئن حضرات کا فی صد تلاش کرنا چاہیے- یہ ضروری اس لیے بھی ہے کہ یہاں بات نسبتاً اور مقابلۃً ہی کہی جا سکتی ہے اور کہی جانی بھی چاہیے- تحریر میں یہ بات بھی شدید انداز سے کہی گئی ہے کہ فضلائے مدارس کے عصری اداروں کی طرف کثرت سے رخ کرنے کے دوران ''ارباب مدارس کی نظر میں مدارس کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی'' جب کہ سچائی یہ ہے کہ پچھلے کچھ سالوں سے اہل مدارس کے نزدیک یونیورسٹیوں کی تعلیم، فضا اور یہاں تشکیل پانے والی فکر اور حاصل ہونے والے مختلف طرح کے تجربات کی اہمیتیں بڑھی ہیں جو کہ درست ہے اور بہت حد تک سچائی کا احساس و اعتراف ہے- جواب میں فضلائے مدارس کی عصری دانش گاہوں میں آمد کی موجودہ صورت کو جو ''جنون کے تحت'' سے تعبیر کیا گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ جام نور کا یہ استقرار درست ہو، ورنہ ہمیں تو ایسا لگ رہا ہے کہ عبوری دور کے بعد اب اس میں دھیرے دھیرے سنجیدگی بڑھ رہی ہے-

آخر میں ضروری طور پر عرض کرنا چاہوں گا کہ ناچیز نے خصوصی طور پر یہ تشویش اس لیے جام نور کے سپرد کی ہے کہ پچھلے مختلف شماروں کے ''استفسار'' میں ایک دو تحریریں کچھ اس طرح کی نظر سے گزر چکی ہیں کہ جو اپنے بعض جملوں یا بین السطوری ترشحات کی روشنی میں عصری جامعات میں تحصیل علم کے خواہش مند فضلائے مدارس کے لیے حوصلہ شکن محسوس ہوئیں- اس کے علاوہ یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے فضلائے مدارس سے متعلق ایک تحریری مباحثے میں جناب ڈاکٹر خواجہ اکرام صاحب، جے این یو کی بھی ایک بات بڑی افسوس ناک اور قطعاً بے تکی نظر سے گزری-

در اصل ہمیں ایسا لگ رہا ہے کہ عصری اداروں میں پڑھنے کے خواہش مند طلبہ مدارس کی اب جام نور ترجیحی انداز میں حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا اور یہ شاید اس بات کا نتیجہ ہے کہ جام نور کے سامنے اب مطلع بہت زیادہ صاف نہیں ہے، یا پھر اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے مطلع واقعی صاف ہے اور وہ یہ کہ اب یہ اکتاہٹ ہونے لگی ہے کہ کہاں بہت زیادہ معاشی اطمینان نظر آ رہا ہے، حالاں کہ اگر ایسا ہے تو ہمارے خیال میں یہ محدود طریقے پر عجلت میں کیے گئے غور و خوض کا نتیجہ ہے کہ جس میں دیگر بہت سی ضروری چیزوں کو نظر انداز کر دیا گیا اور متعین سطح ذہن سے اوپر اٹھ کر کچھ

لازمی پہلوؤں پر تجزیاتی غور و فکر نہیں کیا گیا- بہر حال یہ میرے ذہنی خلجانات ہیں جو میری سطحی فکر کی چغلی کھا رہے ہیں- اب دیکھیں جام نور کا انشراح صدر ہماری کیا رہ نمائی کرتا ہے-

ادارتی نوٹ:- استفسار سے متعلق اپنے ذہنی خلجان کی مخلصانہ پیش کش پر مبارک باد قبول فرمائیں- حیرت ہے! جس ادارے کو عصری تعلیم کی حمایت کرنے کی پاداش میں ایک طبقے کی طرف سے ہمیشہ مطعون کیا جاتا رہا آج برسوں بعد بھی اس سے اپنے موقف کے اظہار کا مطالبہ کیا جا رہا ہے؟ آپ کے بعض توقعات، خدشات اور مجمل تعاقبات سے قطع نظر عصری جامعات میں طلبۂ مدارس کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے آپ کے خیال خاطر کے لیے جام نور اپنا یہ موقف واضح کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ جام نور عصری جامعات میں تعلیم و تعلم کو ناجائز و حرام نہیں سمجھتا جیسا کہ بعض فتوی بکف تقدس مآب جو خود اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر اور ایم اے کا پیوند فخریہ لگاتے ہیں، مگر عصری تعلیم کی مخالفت میں اپنے زبان و قلم سے شعلے برسانا دینی فریضہ بھی سمجھتے ہیں- جام نور اس بات کو غلط سمجھتا ہے کہ طلبۂ مدارس ہدف کے تعین کے بغیر "عصری تعلیم" کے مبہم شور میں یہاں پہنچیں اور اپنا قیمتی وقت اور وہ دینی مزاج جو مدرسے سے انھیں ملا ہے، اسے ضائع کر دیں- جام نور اس بات کا ہرگز مخالف نہیں کہ عصری جامعات میں پہنچ کر طلبہ اپنی معاشی خوشحالی کے لیے جد و جہد کریں- ہاں! اسے ان طلبۂ مدارس سے شدید طور پر شکوہ ضرور ہے جو "دین" کے بالمقابل "معاش" کو ہی سب کچھ تصور کرنے لگتے ہیں- کیا آپ کو یونیورسٹیز کے اندر ایسے طلبۂ مدارس نہیں ملے جن کے نزدیک داڑھی اور ٹوپی سامان مذاق بنتی جا رہی ہیں؟ ایسے طلبہ سے آپ کو راست سابقہ نہیں پڑا جو اپنے عالم و فاضل ہونے کو چھپانا اعزاز سمجھتے ہیں؟ کیا ایسے رجحانات کی بھی آپ جام نور سے حوصلہ افزائی چاہتے ہیں؟ جام نور ملت کا ترجمان اور اہل سنت کا نقیب ہے- اسے ہر قیمت میں ملت کی سرخروئی اور اہل سنت کی سرفرازی عزیز ہے- وہ طلبۂ مدارس جو دین اور تبلیغ دین سے خود کو بری رکھنا اپنا حق سمجھتے ہیں جام نور ان کی شخصی آزادی اور ذاتی پسند پر انگلی نہیں اٹھاتا، لیکن ان سے یہ سوال ضرور کرتا ہے کہ انھیں یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ سالہا سال مدارس کی رقم پر پلیں بڑھیں اور جوان ہوں جو رقم عام مسلمانوں سے خالص دین اور تبلیغ دین کے نام پر حاصل کی گئی تھی- جام نور فضلائے مدارس کے لیے یونیورسٹیز کی تعلیم کا صرف اس لیے حامی ہے تاکہ وہ اس کے بعد خدمت دین و ملت مزید بہتر انداز میں کر سکیں- اب ایسے میں جن طلبۂ مدارس کی ترجیحات میں یہ مقصد مفقود ہے، جام نور ایسے طلبہ کی حوصلہ افزائی سے معذور ہے-

مستحب کاموں کے لیے فرائض کا ترک کیوں؟

ضیاء المصطفیٰ سیوانی

متعلم جماعت سادسہ، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

مکرمی ایڈیٹر صاحب! سلام مسنون...... یہ مسلمات میں سے ہے کہ نماز اہم العبادات اور افضل الفرائض ہے اور اعمال میں قرب خداوندی کا سب سے بڑا وسیلہ بھی نماز ہی ہے- نماز روزی میں برکت کا ذریعہ ہے اور نماز جملہ بے حیائی و برائی سے بچاتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عرس منانا ایک امر مستحب ہے، بزرگان دین کے تذکرہ کے لیے محفلیں منعقد کرنا کار خیر ہے، اسلاف کا طریقہ ہے اور ہم سنیوں کی بھی پہچان ہے، مگر یہ کہاں درست ہے کہ امر مستحب کے لیے فرائض و واجبات کا ترک جائز ہو؟ آج عموماً اعراس میں، جو امر مستحب ہے، یہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ فرائض و واجبات و سنن کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے یا یہ کہ وہ فرائض سے بڑھ کر ہیں یا یہ کہ ان کے لیے فرائض و واجبات کا ترک جائز ہے؟ حالانکہ ایسا نہیں- بعض اعراس میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لمبی لمبی فاتحہ پڑھنا، خوب چمک دمک والی چادریں چڑھانا، گل پوشی کرنا، فجر تک گرج گرج کر تقریریں کرنا، سننا اور نعرے بازی کرنا ہی اہم الفرائض اور افضل العبادات ہے جہلا اور پیشہ ور مقرروں کا تو یہ حال ہے ہی مگر افسوس صد افسوس بعض علما اور طلبہ بھی اس سے بری نہیں-

راقم الحروف نے اس بارے میں جب غور و فکر کیا تو اپنی ناقص عقل کی رہنمائی سے اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی عرس مذکورہ برائی سے مستثنیٰ نہیں الا ماشاء اللہ- عرسوں میں اکثر و بیشتر علما و طالبان علوم نبویہ ہی بارگاہ ابو الفیض سے کسب فیض کے لیے شرکت سے شرف یاب ہوتے ہیں- یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادھر اذان و اقامت ہو رہی ہے اور ادھر طلبہ اور بعض نام نہاد علما یا تو کتب خانوں پر کتب بینی میں مشغول ہیں یا پھر ٹوپیوں یا کپڑوں کی دوکانوں پر دوکانداروں سے محو گفتگو ہیں یا پھر چند افراد بیٹھ کر باہم گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، ان تمام باتوں کے دیکھنے کے بعد ذہن پر یہ سوال نمودار ہوتا ہے کہ کیا

امر مستحب میں کھو کر فرائض کا ترک جائز ہے؟ ہرگز نہیں! تو پھر کیوں امر مستحب کے نام پر فرائض سے لاپروائی برتی جارہی ہے؟ اللہ کی بارگاہ میں اگر
نے سر نیاز جھکانا چھوڑ دیا تو پھر ہم سے بڑھ کر بے عقل، احمق اور نادان کون ہوگا؟ اور شیطان بھی تو یہی چاہتا ہے کہ ہم امر مستحب کے نام پر
اطاعت ختم کرنا چھوڑ دیں تاکہ وہ خوش ہو جائے- لہذا ہم پر لازم ہے کہ اولین فرصت میں نماز کی طرف سبقت کریں اور سلف صالحین، صاحب
کے واقعات، حالات وقصص سے درس عبرت پکڑیں-

اعلی حضرت فاضل بریلوی پر جنوبی ہند میں تحقیقی مقالات

محمد عرفان محی الدین قادری
ریسرچ اسکالر: عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (اے پی

مولانا خوشتر نورانی صاحب! السلام علیکم...... آپ کے موقر رسالہ "جام نور" کے شمارے "محدث اعظم نمبر" اور مئی ۲۰۱۱ء باصرہ نواز ہوے
"محدث اعظم نمبر" میں پروفیسر عبدالحمید بیدار شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کا مقالہ شائع ہوا، ان کا نام عبدالحمید بیدار نہیں بلکہ عبدالمجید بیدار ہے-
مئی ۲۰۱۱ کے شمارے میں مولانا ذیشان احمد مصباحی کا مقالہ رضویات میں نئی فکر پیش کر رہا ہے- مولانا نے جن امور کی طرف توجہ مبذول کرا
ہے یقیناً بجا ہے- فتاوی رضویہ کا عربی ترجمہ اس لیے ضروری ہے کہ اس سے عرب ممالک میں اعلی حضرت فاضل بریلوی کو متعارف کرانا آسان
ہوگا- اعلی حضرت فاضل بریلوی کی کئی کتب کی تعریب بھی ہو چکی ہے اور وہ منظر عام پر آچکی ہیں- عربی زبان میں کتاب کو منتقل کرنے کا کام جو
و پاک اور مصر میں ہوا اس سے اعلی حضرت کی علمی و عبقری شخصیت عالم اسلام میں متعارف ہوئی- مولانا وجاہت رسول قادری نے مجھے یہ اطلاع
تھی کہ فتاوی رضویہ سے عربی فتاوی کی تخریج دو جلدوں میں ہو چکی ہے، لیکن ابھی اس کی تحقیق باقی ہے- فتاوی رضویہ کو عربی میں ترجمہ کرنے سے
ان دو جلدوں کو مع تحقیق و تخریج منظر عام پر لایا جائے-

مولانا ذیشان مصباحی نے عربی زبان میں اعلی حضرت فاضل بریلوی کی خدمات پر جو کام ہوا اس کے متعلق یہ تحریر کیا ہے:
"مولانا ممتاز احمد سدیدی نے جامعۃ الازھر سے عربی شاعری پر مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی-" مولانا ممتاز احمد سدیدی کا یہ مقالہ
فل (M.Phil) کی ڈگری کے لیے لکھا گیا تھا- اعلی حضرت فاضل بریلوی پر عربی زبان میں جو تحقیقی مقالات پیش کیے گئے اس کی تفصیل یہ ہے:
(۱) ڈاکٹر محمود بریلوی نے شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے "اعلی حضرت کی عربی زبان میں خدمات" پر ایم- فل کا مقالہ پیش کیا باوجود
یہ کام شعبۂ عربی سے ہوا لیکن مقالہ اردو میں تحریر کیا گیا اور انھیں ڈگری تفویض کی گئی-
(۲) مولانا ممتاز احمد سدیدی نے جامعۃ الازھر مصر سے "الامام احمد رضا شاعرا عربیا" پر ایم فل کا مقالہ پیش کیا جس پر انھیں ڈگری
تفویض کی گئی-

اعلی حضرت فاضل بریلوی پر عربی زبان میں ہند و پاک میں صرف ایک پی ایچ ڈی کا ذکر ملتا ہے-
(۱) ڈاکٹر سید شاہد علی نورانی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور پاکستان سے "الشیخ احمد رضا شاعرا عربیا مع تدوین دیوانہ" پر مقالہ
پیش کیا اور انھیں ۲۰۰۴ء میں ڈگری تفویض کی گئی- اسی پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹر محمد اسحاق جلالی صاحب نے "الزلال الانقی من بحر سبقۃ
الاتقی" پر پی ایچ ڈی کی ہے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ عربی زبان میں ہے یا اردو زبان میں-
اعلی حضرت فاضل بریلوی پر ہندوستان میں ایک بھی پی ایچ ڈی عربی زبان میں نہیں ہوئی- اعلی حضرت فاضل بریلوی پر جنوبی ہند میں
تحقیقی مقالات پیش کیے گئے ان میں ایک اردو میں پی ایچ ڈی ہے اور تین مقالات عربی زبان میں ہیں-
(۱) مولانا غلام مصطفی نجم القادری نے میسور یونیورسٹی سے "امام احمد رضا اور عشق مصطفی" پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ پیش کیا اور انھیں ڈگری
تفویض کی گئی عربی زبان میں جنوبی ہند میں تین مقالات پیش کیے گئے جس کی تفصیل یہ ہے:
(۱) سید غوث محی الدین عرف اعظم پاشا خانوادۂ موسویہ حیدرآباد کے چشم و چراغ کو شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر غلام محمد کے

نگرانی "الشیخ احمد رضا خان حیاته و اعماله" پر ڈگری تفویض کی گئی، یہ مقالہ ۱۹۹۰ء میں پیش کیا گیا۔

(۲) مولانا مصطفےٰ علی مصباحی تمل ناڈو چینئی کی خانقاہ قادریہ سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے شعبۂ عربی نیو کالج ملحقہ مدراس یونیورسٹی سے ڈاکٹر احمد زبیر پروفیسر نیو کالج چنئی تمل ناڈو کے زیر نگرانی "مساهمة الشیخ احمد رضا خان فی الادب العربی" پر اپنا مقالہ پیش فرمایا ۲۰۰۶ء میں ڈگری تفویض کی گئی۔

(۳) تیسرا مقالہ مجھ ناچیز محمد عرفان محی الدین کا ہے جو "دراسة عن الحواشی للعلامة احمد رضا خان علی امهات الکتب فی الحدیث الشریف" پر تحریر کیا گیا جو پروفیسر محمد مصطفےٰ شریف کے زیر نگرانی تکمیل ہوا، ۲۰۰۹ء میں ڈگری تفویض کی گئی۔

جنوبی ہند کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں سے تین مقالات خالص عربی زبان میں پیش کیے گئے۔ حاشیہ جد الممتار بھی حیدر آباد ہند سے پہلی بار مطبع عزیزیہ سے شائع ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں راست علامہ محمد احمد مصباحی کے زیر نگرانی اس کی اشاعت عمل میں آئی۔

مولانا ذیشان مصباحی صاحب نے ویب سائٹ (Website) کے متعلق جو اظہار خیال کیا ہے، یقیناً درست ہے کہ بیک وقت اردو، عربی، انگلش میں فاضل بریلوی کی شخصیت و سوانح پر مواد ہو۔ اس کے متعلق یہ عرض کرنا کافی ہے کہ www.alahazratnetwork.org میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی دو سو سے زائد کتب دستیاب ہیں۔ فتاویٰ رضویہ کی مکمل تیس جلدیں موجود ہیں اور انگریزی میں بھی کچھ کتابیں اور مواد دستیاب ہے۔ عربی حواشی بھی موجود تھے بعد میں اسے ویب سائٹ سے نکال لیا گیا۔ Download کی بھی سہولت ہے۔ حاشیہ جد الممتار کی تین مکمل جلدیں www.dawateislami.net میں دستیاب ہیں۔ ماہنامہ "معارف رضا" کراچی کے لیے www.imamahmadraza.net دیکھیے۔ کتب اعلیٰ حضرت کی تعریب شدہ کتابیں www.alahazrat.net پر دستیاب ہیں۔

حیدر آباد کے چند محققین عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے مقالات کئی سیمینار میں پیش کیے ہیں (۱) پروفیسر عبد المجید صاحب شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی نے (EFLU) English & Foreign Languages University میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر مقالہ پیش کیا۔ (۲) پروفیسر محمد مصطفےٰ شریف صاحب شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی نے گلبرگہ میں "امام احمد رضا کانفرنس" میں امام احمد رضا کی محدثانہ عظمت پر اردو میں مقالہ پیش فرمایا۔ (۳) ڈاکٹر شجاع الدین عزیز شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی نے سالار جنگ میوزیم میں "سیرت النبی کانفرنس" میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور سیرت النبی پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ (۴) ڈاکٹر عماد الدین صاحب نے مدراس یونیورسٹی میں علم حدیث پر ایک سیمینار میں "مساهمة الشیخ احمد رضا خان فی علم الحدیث" پر اپنا مقالہ عربی زبان میں پیش فرمایا۔ (۵) محمد عرفان محی الدین نے عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک ترجمہ کے سیمینار میں "اعلیٰ حضرت کی تعریب شدہ کتب" پر اپنا مقالہ عربی زبان میں پیش کیا۔

رضویات پر مقالات شائع کرنے پر میں جام نور کا شکر گزار ہوں، اللہ رب العزت جام نور کو مزید ترقی عطا کرے۔ □□□

بقیہ: تذکار :- یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ کوئی عام مجلس نہیں تھی بلکہ اس مجلس کے ارکان اپنے زمانہ کے اجلۂ علما کرام تھے، مجلس کے دستور العمل میں جن ارکان مجلس کے اسمائے گرامی درج ہیں ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

۱- حضرت تاج الفحول مولانا عبد القادر محب رسول قادری بدایونی ۲- حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی ۳- حضرت مولانا محمد عبد المقتدر صاحب قادری بدایونی ۴- حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی ۵- مولانا حکیم عبد القیوم عثمانی برکاتی بدایونی ۶- مولانا عبد السلام صاحب جبلپوری ۷- مولانا حافظ بخش قادری آنولوی- فہرست میں تقریباً ۲۵ علمائے کرام کے اسما درج ہیں جن میں چند نام ہم نے یہاں نقل کیے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے معاصرین کی نظر میں حافظ بخاری کا کیا مقام و مرتبہ تھا، اس مجلس علمائے اہل سنت نے احقاق حق اور ابطال باطل کا حق ادا کر دیا، ارباب ندوہ کو ہر چند راہ راست پر آنے کی دعوت دی، لیکن وہ حضرات اپنی روش بدلنے کو تیار نہ ہوئے، لیکن علمائے اہل سنت نے ہر طرح افہام و تفہیم کے ذریعے اپنا فرض ادا کر دیا اور عوام کو ارباب ندوہ کے فکری اور عملی انحراف سے کما حقہ آگاہ کر دیا۔ اس سلسلہ میں ملک کے طول عرض میں متعدد اجلاس منعقد کیے گئے، اور بے شمار رسائل افہام و تفہیم اور رد و ابطال کے لیے شائع ہوئے۔ □□□

مسائل اور الجھنیں

قارئین جام نور اس کالم میں دینی، علمی، فکری، ادبی، تعلیمی، سائنسی، سیاسی اور سماجی مسائل سے متعلق اپنے سوالات/ الجھنوں کا جواب حاصل کرسکتے ہیں- اس کے لیے قارئین اپنے سوالات مختصر لفظوں میں لکھ کر ادارے کے پتے پر ارسال کریں- (ادارہ)

اپنے گھر کی کفالت کرنا چاہتا ہوں

سوال: میں جماعت رابعہ کا طالب علم ہوں، چھ بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں اور B.C.A، M.C.A یا B.Tech.M.Tech کرنا چاہتا ہوں تاکہ چھوٹے بھائیوں کی اچھی کفالت اور انہیں اعلی تعلیم سے آراستہ کر سکوں- دریافت طلب امر یہ کہ دونوں میں میرے لیے کون زیادہ بہتر ہے اور مستقبل کیسا ہے، کامیابی کے امکانات کتنے ہیں، بنیادی چیزیں کون سی ہیں اور کس بیس پر داخلہ ہوگا- ساتھ ہی بہترین ادارہ، اخراجات اور کورس کی مدت کی بھی وضاحت کریں- واضح رہے کہ میرا تعلق مدرسہ بیک گراؤنڈ سے ہے-

عبداللہ، رکن پیس فاونڈیشن، سیتامڑھی (بہار)

جواب: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا- (البقرۃ:۲۸۶) اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ گراں بار نہیں کرتا- یہ فارمولہ زندگی کے عام حالات میں ہمارے لیے بھی قابل عمل بلکہ واجب العمل ہے- جو جن حالات میں ہے انہی حالات کے مطابق کام کرنے اور دوسروں کا بوجھ اٹھانے کا مجاز ہے- آپ اپنے بھائیوں کی کفالت ضرور کیجیے لیکن حالات واسباب کو ہمہ وقت پیش نظر رکھیے- یہ ایک بنیادی بات ہے-

میرے خیال میں دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد بقدر طاقت آپ اپنے بھائیوں کی اچھی کفالت کر سکتے ہیں- اس کے لیے ابھی سے یعنی عالمیت سے بھی پہلے دینی تعلیم سے دست بردار ہونا میرے خیال میں کوئی نیک فال نہیں ہے- اور اگر آپ نے طے ہی کر رکھا ہے کہ دینی تعلیم مکمل نہیں کرنی ہے تو فوراً آپ کو اسکول میں داخلہ لے لینا چاہیے- ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ میں ایڈمیشن لے لیجیے اس کی تکمیل تک معلومات اور تفصیلات از خود حاصل ہو جائیں گی-

مذہبی اور جدید ذہن میں فاصلہ کیوں

سوال: میں جام نور کا مستقل قاری ہوں- میں اسے پڑھتا ہوں تو میری نیند اڑ جاتی ہے- آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو جزائے خیر فرمائے- ایک بات میں برابر سوچتا رہتا ہوں ک[illegible] مذہبی اور جدید ذہن میں اتنا فاصلہ کیوں ہ[illegible] کیوں دونوں ایک دوسرے کو سماج کے لیے بے کار[illegible] تصور کرتے ہیں؟ کیا یہ خلیج پاٹی جا سکتی ہ[illegible]

محمد شہزاد عطاری، کراچی (پا[illegible]

جواب: سولہویں صدی میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی [illegible] چلی اس نے یورپ کو کئی طرح سے مال مال کیا- صنعت و[illegible] سائنس وٹکنالوجی، علم وتحقیق، ادب اور فن ہر میدان زندگی میں غی[illegible] ترقی ہوئی- اس نے زندگی کی عام سطح کو زمین سے اٹھا کر آسما[illegible] دیا- اتفاق سے عروج وارتقا کی یہ ساری داستانیں عیسائیوں [illegible] وابستہ تھیں کچھ عیسائی وہ تھے جو عیسائیت کو پوری دنیا پر مسلط [illegible] خواب دیکھ رہے تھے اور دوسرے کچھ وہ تھے جو پاپائیت کی بر[illegible] اور مذہبی سفید پوشوں کی سیہ کاری کے سبب مذہب سے بیزار [illegible] تھے- اس طرح جن لوگوں نے نئی دنیا کی تشکیل کی وہ یا تو عیسائی[illegible] مبلغ تھے یا مذہب کے مخالف تھے-

ماضی کے بالمقابل حال کی بالکل نئی دنیا میں جب مسلمان [illegible] ہوئے تو انہیں ہر طرف وحشت کا سامنا کرنا پڑا- کیونکہ نئی دنیا م[illegible] عیسائیت کی عالم گیر اشاعت ہو رہی تھی یا مذہب بیزاری کی-

اس صورت حال کو دیکھ کر مسلمان مختلف منفی نفسیات کا [illegible]

گئے- مسلمانوں کے ایک طبقے نے مذہب بیزاری کو ہی ترقی کا زینہ سمجھ لیا جب کہ دوسرا طبقہ نئی زندگی کی ہر علامت کو دیکھ کر لاحول پڑھنے لگا- یہی نفسیات جدید ذہن اور مذہبی ذہن میں فاصلے کا سبب بنی- اسی کا اثر ہے کہ جدید ذہن کے حاملین مذہبی طبقے کو فرسودہ اور از کار رفتہ تصور کرتے ہیں جب کہ مذہبی طبقے جدید ذہن کے حاملین کو دین و مذہب کا دشمن باور کرتے ہیں-

اکیسویں صدی میں جدید ذہن کے حاملین مذہب کی طرف مائل ہوتے ہیں اور مذہبی افراد جدید افکار وعلوم سے متعارف ہوتے ہیں- اس کی وجہ سے اب بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو رہا ہے- اب کچھ ایسے مذہبی نمائندے سامنے آئے ہیں جو تمام تر جدید اسباب و ذرائع سے واقف ہیں- نئے افکار وخیالات اور جدید معاشرت کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں- انہوں نے جدید ذہن کے غرور کو توڑا ہے اور اسی طرح جدید ذہن کے حاملین سے پہلے عام وحشت تھی وہ کم ہوئی ہے- اس بدلتے ماحول کے پیش نظر امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں یہ خلیج ختم ہو جائے گی- درمیان میں حائل غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا- مذہبی افراد عصری ذرائع کو بھرپور استعمال کریں گے اور جدید طرز معاشرت کے دلدادہ اپنی روحانی تسکین کے لیے مذہب کے سرچشمے سے استفادہ کریں گے-

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ ہر دور میں مختلف افکار و خیالات کے حاملین موجود رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے- مذہبی اور لامذہبی دونوں طبقات ہمیشہ پائے گئے ہیں، پھر ان میں معتدل اور غالی ومتشدد بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے البتہ ان میں تناسب کا فرق ہوتا رہتا ہے- ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فکر ونظر کا اختلاف اور معاشرت ومعیشت کا تضاد فطرت کا حصہ اور انہی نظام کا جزو ہے جس نظام سے لڑنا ناممکن ہے-□□□

بقیہ: تحریر مباحثہ

مثالی مسلم سماج کی تشکیل وتعمیر کے لیے ضروری ہے کہ نئی نسل کی نمائندہ تینوں نسلیں موجود ہوں- یعنی ایک اسلامی تعلیم سے آراستہ مسلم نوجوان ہوں جو گھر گھر ایمان کی دعوت دینے والے ہوں جن کے دل میں دین وملت اور سماج کے لیے دھڑکتا ہوا دل ہو، خود بھی اعلی اخلاقی خصوصیات سے مزین ہوں تاکہ لوگ ان سے قریب ہو سکیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں، دوسری طرف اعلی عصری تعلیم سے آراستہ ایسے نوجوان ہوں جو دین وملت اور سماج کے لیے بیدار شعور اور حساس قلب رکھتے ہوں، وہ "اپنی جڑوں سے پیوستہ ہوں، وہ اپنے اپنے میدان عمل میں رہتے ہوئے دین وملت اور سماج کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں- کچھ ایسے بھی نوجوان ہوں جو اسلامی اور عصری دونوں تعلیم سے آراستہ ہوں اور اہداف واضح ہوں دونوں جماعت سے تعلق رکھنے والے ہوں تاکہ دونوں ملت کی پیشوائی کا فریضہ انجام دے سکیں اور ان نمائندہ نسلوں کی تعمیر وتشکیل ایسے خطوط پر ہو کہ اگر وہ مدارس سے فارغ ہوں تو ان کا قلب ایمانی حرارت سے جوش مارتا ہو، دین وملت کی خدمت کا جذبہ ہو، ان کی فکری افق میں وسعت ہو تاکہ وہ ہر معاملے میں مقاصد شرع کو سامنے رکھ سکیں ان کو ایمان، فقہ اور بصیرت حاصل ہو اور دینی خدمت کے سلسلے میں وہ اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر کے میدان عمل منتخب کر سکیں-

اور اگر وہ عصری دانش گاہوں کے فارغ ہوں تو انہیں اس بات کا احساس ہو کہ وہ اول مسلمان ہیں، دین وملت اور سماج کے لیے ان کی کچھ ذمہ داریاں ہیں وہ صرف اور صرف معاشی حیوان نہیں ہیں اور اگر وہ اسلامی مدارس اور عصری دانش گاہوں دونوں کے سند یافتہ ہوں تو وہ اس بات کا ضرور خیال رکھ سکیں کہ اللہ تعالی نے ان کو دونوں طرح کے علم سے نوازا ہے، دونوں جہانوں کا انہوں نے جائزہ لیا ہے لہذا وہ بہتر طریقے سے دین وملت اور سماج کی خدمت کر سکتے ہیں- عصر حاضر میں اسلام کی عالمی دعوت وتبلیغ اور مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے بھی انہی تینوں قسم کے دعاۃ ومبلغین اور سفرا درکار ہیں جو اپنے اپنے انداز سے اسلام کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ انجام دیں-

اگر ایسی نئی نسل تیار ہو جاتی ہے تو اس سے دین وملت اور سماج کی عظیم خدمت ہوگی، مسلم معاشرہ جو اس وقت تنزلی کا شکار ہے وہ پھر سے بام عروج کو پہنچ جائے گا اور ایک صالح معاشرہ سامنے آئے گا- ہر سطح پر دین وملت اسلام وسنیت کی دعوت وتبلیغ کا کام بخوبی انجام پائے گا اور پھر لوگ اسلام کی ان قدروں اور خصوصیتوں کو دیکھتے ہوئے تیزی کے ساتھ اسلام کی طرف رجوع کریں گے اور اسلام کے دامن رحمت میں پناہ لیں گے-□□□

پاکستان کے معروف محقق اور عالم دین

محترم مولانا سید شاہ حسین گردیزی سے ملاقات

مولانا سید شاہ حسین گردیزی برصغیر کی ایک معروف دینی و علمی شخصیت ہیں- آپ کی ولادت پاکستان میں ضلع راولپنڈی کی تحصیل ٹیکسلا کے ایک گاؤں "بدو" میں ہوئی- آپ نجیب الطرفین سید ہیں اور سادات گردیز سے تعلق رکھتے ہیں- ابتدائی تعلیم اپنے والد حضرت سید مقبول شاہ گردیزی سے حاصل کی- پھر جامعہ غوثیہ گولڑا شریف میں حضرت سید عبدالقادر شاہ بغدادی سے قرآن حکیم حفظ کیا- اسی وقت حضرت شاہ غلام محی الدین گولڑوی کے دست حق پرست پر سلسلہ عالیہ چشتیہ میں شرف بیعت حاصل کیا- درس نظامی کی تعلیم مولانا سکندر شاہ، مولانا عبدالرزاق، مفتی فیض احمد، مولانا سید محمد زبیر شاہ اور مولانا عبدالحکیم شرف قادری سے حاصل کی- آپ کے اساتذہ میں مولانا عطا محمد بندیالوی، مفتی وقار الدین اور سید شجاعت علی قادری بھی شامل ہیں- آپ نے شروع میں دارالعلوم نعیمیہ کراچی میں تدریس اور جامع مسجد گل زار کراچی میں خطابت کے فرائض انجام دیے- مولانا کو اعلیٰ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی سے خصوصی نسبت ہے- اسی نسبت سے انہوں نے دارالعلوم مہریہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا- آپ کئی علمی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں مہر جہاں تاب، فروغ صحافت میں اہل سنت کا کردار، تجلیات مہر انور وغیرہ خاصی اہم ہیں- آپ کو سب سے زیادہ شہرت آپ کی دو معرکہ آرا کتابوں "حقائق تحریک بالاکوٹ" اور "لفظ ذنب کی تحقیق" سے ملی- اول الذکر کا ترجمہ بنگالی اور ہندی زبانوں میں بھی آ گیا ہے- یہ سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے فسانۂ جہاد سے متعلق ہے جب کہ ثانی الذکر مولانا غلام رسول سعیدی کی لفظ ذنب سے متعلق تحقیق کے جواب میں ہے- یہ وقیع کتاب آٹھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے- دینی، علمی، دعوتی و تبلیغی اور جماعتی مسائل سے متعلق مولانا سے لیے گئے انٹرویو کے اہم اقتباسات حاضر ہیں ———— **خوشتر نورانی**

جام نور :- آپ کی تعلیم و تربیت کہاں ہوئی، آپ کے اساتذہ کون تھے اور اس وقت کا نظام تعلیم کیسا تھا؟

مولانا شاہ حسین گردیزی :- میری ابتدائی تعلیم گولڑہ شریف میں ہوئی- سید عبدالقادر شاہ بغدادی صاحب جو میسور کے رہنے والے تھے، لیکن اس وقت گولڑہ شریف میں رہ رہے تھے، وہ کچھ عرصہ بغداد شریف بھی رہ کر آئے تھے، ان سے میں نے قرآن پاک حفظ کیا- آج جو کچھ خصوصیات میرے اندر ہیں وہ سب انہی کی تربیت کا نتیجہ ہے-

سید سکندر شاہ صاحب سے میں نے فارسی کی متعدد کتب، فصول اکبری اور کافیہ تک انہی سے پڑھی- ایک بار انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ ایک طالب علم کہہ رہا تھا کہ تمہیں کافیہ زبانی یاد ہے؟ میں نے کہا جی ہاں! تو انہوں نے کہا سناؤ! جب میں کافیہ کی بحث مجرورات تک پہنچا تو انہوں نے فرمایا اب بس کرو- انہیں علم نحو سے بہت شغف تھا- انہوں نے مجھے سولہ پارے تک صرفی و نحوی قواعد کی مشق کے ساتھ قرآن پاک پڑھایا تھا- ایک دن نحوی تراکیب اور دوسرے دن صرفی قواعد کی مشق ہوا کرتی تھی- وہ مجھے جلالین بھی پڑھاتے تھے اور اپنی خصوصی دلچسپی کی وجہ سے نحوی و صرفی بحث کا اجرا بھی کراتے تھے- اس کے بعد زبیر شاہ صاحب، مولانا عبدالحکیم شرف قادری صاحب اور آخر میں مولانا عطا محمد بندیالوی صاحب سے تعلیم حاصل کی- زبیر شاہ صاحب ان لوگوں میں سے تھے جنہیں درس نظامیہ از بر یاد رہتا تھا- میرے اصل استاد مولانا عطا محمد بندیالوی تھے، ان سے رابطہ تو گولڑہ شریف سے ہی تھا، البتہ ان سے پڑھنا تاخیر سے شروع کیا- مولانا وقار الدین اور مفتی شجاعت علی صاحب سے پڑھا- ہر استاد کا اپنا طریق کار تھا- پہلے عبارت خوانی ہوتی تھی پھر ایک عمومی تقریر استاد کرتے تھے اور پھر ترجمہ کرتے تھے، اس پر اچھی خاصی مشق ہوتی تھی، لیکن مولانا عطا محمد صاحب کا طریقہ بڑا عجیب و غریب تھا وہ ہر ہر جملہ کی تفصیلی تشریح فرماتے تھے، ہر ہر لفظ کی تشریح کرتے تھے، ان کے نزدیک ایک جملہ کے جتنے مطالب ہو سکتے تھے سب بیان فرماتے تھے- جب ہم نے ان سے مختصر المعانی شروع کی تو صرف نحمدک کی تشریح میں چار دن لگ گئے اور سبق بھی اس وقت چلتا تھا جب تک استاد چاہیں-

جام نور: -تصنیف وتالیف کا شوق کب سے ہوا؟

مولانا شاہ حسین گردیزی: -لکھنے کا شوق تو شروع سے ہی تھا- ابتدا میں میری کوئی تحریر شائع نہیں کی جاتی تھی، اس لیے اخبارات میں مراسلات ہی لکھتا تھا، پھر اہل سنت کے رسائل میں چھپنا شروع ہوا، اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا، اس دور میں کافی عرصے تک ایک رسالہ ''ترجمان اہل سنت'' کی ادارت بھی کی-

جام نور: -تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی صاحب کی تصنیف ''تصحیح العقیدہ'' کی طرف آپ کی توجہ کیسے ہوئی؟ اور وہ آپ کو کہاں سے ملی؟

مولانا شاہ حسین گردیزی: -یہ کتاب اتفاقاً مجھے نہایت بوسیدہ حالت میں مجتبائی پریس سے ملی، اس کی میں نے جلد بندی کروائی اور مطالعہ کرنا شروع کیا، حالانکہ میں کبھی بدایوں نہیں گیا، لیکن بعض نام ایسے ہوتے ہیں جنہیں سن کر ہی کشش کا احساس ہوتا ہے- حضرت مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا فیض احمد بدایونی اور مولانا عبدالقادر بدایونی انہی شخصیتوں میں شامل ہیں- مطالعے کے دوران مجھے احساس ہوا کہ یہ کتاب بہت مفید ہے، اس لیے میں نے اس کتاب کا ترجمہ کردیا اور پھر اسے شائع بھی کردیا- کتاب کی اشاعت کے بعد میرے پاس ڈاکٹر ایوب قادری آئے اور کہنے لگے کہ یہ رسالہ حیدر حسین حیدری کا ہے، آپ نے اسے مولانا عبدالقادر بدایونی صاحب کے نام سے کیسے چھاپ دیا؟ جب میں نے انھیں اصل کتاب دکھائی تو وہ مطمئن ہوگئے- پھر مجھے یاد آیا کہ اہل سنت کی تصانیف کا جو مجموعہ آیا تھا اس میں بعض کتابوں کے نام موصوف نے بھی دیے ہیں، جس میں ''تصحیح العقیدہ'' کو انہوں نے حیدر حسین کے نام منسوب کردیا ہے- بہرحال ان سے یہ غلطی ہوئی تھی، کتاب کی اشاعت کے بعد اس غلطی کا ازالہ ہوگیا- اسی طرح مفتی صدرالدین آزردہ صاحب کا رسالہ منتہی المقال مجھے حکیم محمود احمد برکاتی صاحب سے ملا، اس کا ترجمہ بھی میں نے بڑی محنت اور لگن سے کیا- اس کے بعد میں نے حضرت خواجہ فخرالحسن دہلوی چراغ چشتی کا رسالہ تلاش کیا- جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو مجھے بڑا ملال ہوا کہ ہندوستانی علما نے اس علمی رسالہ پر کوئی توجہ کیوں نہیں دی، جب کہ یہ رسالہ بڑا علمی ہے- مسئلہ تو شاہ ولی اللہ دہلوی کا تھا اور محدث کے طور پر وہی مشہور بھی تھے، خواجہ فخرالحسن صاحب تو محدث مشہور نہیں تھے، لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کے پاس کتنا علم ہوتا ہے، یہ رسالہ عرب جاتا تو عرب والے بھی محسوس کرتے کہ ہندوستانی صوفیہ کتنے راسخ فی العلم ہوتے ہیں- پھر خواجہ رضی حیدر صاحب سے میری ملاقات ہوئی- وہ اخبار میں کام کرتے تھے، لیکن نماز کے لیے مسجد میں آجایا کرتے تھے- وہ کتابی انسان ہیں، ان کی دوستی سے علم میں اضافہ ہوا-

جام نور: -علمی حلقوں میں آپ کی شناخت ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' کے حوالے سے ہے- اس کے اسباب کیا ہیں؟

مولانا شاہ حسین گردیزی: -میری مسجد جہاں میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتا ہوں، وہ ایک کالج سے متصل ہے، وہاں دوتین کالجز اور بھی ہیں جہاں سے نوجوان طلبہ نماز کے لیے آتے تھے، وہ برابر مجھ سے اس حوالے سے سوالات کیا کرتے تھے تو بالآخر میں نے اس حوالے سے دستیاب کتابوں کو اکٹھا کروایا اور مطالعہ شروع کیا- مطالعے کے بعد جو میں نے اپنے طور پر نتیجہ اخذ کیا، اسے کتابی شکل میں تحریر کردیا- اس کتاب کو پڑھ کر کافی بحثیں شروع ہو گئیں، بعض لوگوں نے اسے پڑھ کر اعتراض بھی کیا، لیکن میں نے کہا کہ جن کتابوں کا میں نے حوالہ دیا ہے یا جو نتیجہ میں نے اخذ کیا ہے، اگر وہ غلط ہے تو کوئی مجھ سے رابطہ کرسکتا ہے- پھر میں نے اسے خواجہ رضی حیدر صاحب کو دکھایا، انہوں نے میری محنت کی ستائش کی، میں نے اس وقت حکیم نصیر الدین ندوی کو بھی ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' کا مسودہ دکھایا انہوں نے بھی اسے پسند کیا، اس پر کچھ لکھا بھی اور اس وقت مجھے سو روپے بطور انعام بھی دیے-

جام نور: -وہ نتیجہ کیا تھا، اس کی تلخیص بیان فرمائیں گے؟

مولانا شاہ حسین گردیزی: -میرے الفاظ وہاں کچھ سخت ہوسکتے ہیں، لیکن میں اس مسئلے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سید احمد رائے بریلوی جان بوجھ کر انگریزوں کے ایجنٹ نہیں بنے تھے، بلکہ انگریزوں نے ان سے کہا تھا کہ سکھ فساد پھیلا رہے ہیں وغیرہ اور چونکہ سکھ قوم اس خطے میں مضبوط قوت ہونے کی وجہ سے حاکم تھی اور انگریزوں کو ان کی حکومت کمزور کرنی تھی، اس لیے انہیں اکسا کر وہاں بھیجا اور چند ایک سکھوں کے ساتھ جنگیں بھی ہوئیں جس سے سکھ حکومت کمزور ہوگئی، پھر سید احمد رائے بریلوی نے وہ مسائل اٹھائے جنہیں ان کو نہیں اٹھانا چاہیے تھے- وہ مسائل احناف کے خلاف تھے،

حکومتی ادارے تو نہیں غیر حکومتی ادارے اپنے اپنے مطابق کام کر رہے ہیں، لیکن اس میں نسبتاً دوسرے مکاتب فکر کے اہل سنت کا حصہ کچھ کم ہے- پہلے کے کاموں اور اب میں صرف طریق کار کا فرق ہے-

جام نور :-اہل سنت و جماعت کی شناخت کے لیے کیا ہمیں کسی اور نام کی ضرورت ہے؟

مولانا شاہ حسین گردیزی :-ہم تو اپنے دور طالب علمی سے ہی اس کے قائل ہیں کہ اہل سنت کی شناخت کے لیے ''اہل سنت و جماعت'' کے علاوہ کوئی اور نام نہیں ہونا چاہیے-جب ہم اپنے آپ کو اہل سنت و جماعت کہتے ہیں تو اس میں امریکہ کا سنی بھی ہوتا ہے، عرب کا سنی بھی، ہندوستان کا سنی بھی، ایران کا سنی بھی، بلکہ دنیا کے تمام سنی شامل ہو جاتے ہیں-اس کے برخلاف جب آپ اپنی شناخت کے لیے کوئی اور نام دیں گے تو پھر آپ اس کو محدود کر دیں گے، آپ اہل سنت کو کوزے میں بند نہ کریں، اہل سنت تو ایک سمندر ہے، جس میں پوری دنیا کے سنی آتے ہیں-

ایک مرتبہ میرے پاس ایک مولوی صاحب آئے وہ دیوبندی تھے، اصلاً دیوبندی نہیں تھے، لیکن دیوبندیوں کے ساتھ رہ رہ کے اور ان کے مدرسے میں پڑھا پڑھا کے پورے دیوبندی ہو گئے تھے-ان کے ساتھ گفتگو شروع ہوئی، جہاں ان کے کچھ طلبہ بھی موجود تھے-وہ اپنے طالب علموں سے کہنے لگے کہ یہ بریلوی عالم دین ہیں-میں نے فوراً کہا کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں اہل سنت و جماعت سے ہوں، بریلوی نہیں ہوں، پھر آپ مجھے کیوں بریلوی کہتے ہیں؟ تو انہوں نے اپنے طالب علموں کی طرف دیکھا اور کہا دیکھو! تم لوگ اپنے آپ کو دیوبندی کہلواتے ہو اور یہ اپنے آپ کو اہل سنت و جماعت کہلوا رہے ہیں، اس نکتے کو سمجھو-

جام نور :-اہل سنت و جماعت کے ارتقا کے لیے کس کام پر توجہ دینے کی ضرورت ہے؟

مولانا شاہ حسین گردیزی :-اصل بات یہ ہے کہ جن مخالفین کو آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ آگے بڑھ رہے ہیں یہ کل تک بہت تھوڑے تھے-انہوں نے دینی تعلیم کے نظام کو مستحکم کیا-مدارس عالمیت وفضیلت، مدارس قرات اور مدارس حفظ قائم کر کے انہوں نے اپنا نظام آگے بڑھایا اور بڑھتے بڑھتے آج ان کا اتنا بڑا نظام قائم ہو گیا ہے کہ حکومت وقت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی-انہوں نے اتنی ترقی کر لی اور ہم لوگ صرف تقریریں کرتے رہے-ہم اسی پر گزارہ کرتے ہیں-

آج بھی ہمارے علما اگر اعلیٰ پیمانے پر نہیں تو چھوٹے پیمانے پر ہی دینی مدارس کاروباری جذبے کے ساتھ نہیں دینی جذبے کے ساتھ قائم کریں، طالب علموں کو پڑھائیں، جہاں ہوں وہاں چھوٹا بڑا مدرسہ قائم کر سکتے ہیں تو کریں، صرف مسجد کی خطابت اور امامت پر نہ رہیں تو اس طریقے سے آپ دیکھیں گے کہ کس طرح بنیادی کام آگے بڑھ رہا ہے-دوسری بات یہ ہے کہ تبلیغی جماعت والے اہل سنت و جماعت کی مساجد میں جاتے ہیں اور ان پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ہمیں ان کی مساجد میں جانا ہی نہیں ہے، لہٰذا ہم گھوم پھر کر اپنی ہی مسجد میں آجاتے ہیں-جب کہ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنے قدم آگے بڑھائیں اور ان کی مساجد میں بھی جائیں اور مثبت انداز میں اپنی بات پیش کریں-ہمیں بھی ان کی طرح اختلاف سے بچنا چاہیے-قرآن پاک میں آتا ہے کہ ''وجادلھم بالتی ھی احسن'' احسن طریقے سے اگر اختلاف ہوتا ہے تو ہو البتہ مقصد پر نگاہ ہونی چاہیے کہ ہم آگے کیسے بڑھ سکتے ہیں؟ ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہیے- قرآن سے رہنمائی لینی چاہیے اور اسے مضبوطی سے تھامنا چاہیے-ہم قرآن حکیم کو پکڑیں گے تو وہ آفاقی کتاب ہے، ہم بھی آفاقی ہو جائیں گے اور اگر کسی اور کتاب کو پکڑیں گے تو بات نہیں بنے گی-

جام نور :-جام نور کی مجلس ادارت کے لیے کوئی پیغام؟

مولانا شاہ حسین گردیزی :-جام نور کے چند شمارے میں نے دیکھے اس کے لیے میرے دل سے دعا نکلتی ہے-خدا کرے آپ کی تحریک کامیاب ہو-پاکستان میں بھی اس کا حلقہ بڑھے-آپ کا رسالہ یہاں آتا ہے تو لوگ اسے پڑھتے ہیں، اس کے اثرات نمایاں ہو رہے ہیں اور خدا کرے مزید اس میں ترقی ہو-جام نور کو پہلی دفعہ جب میں نے دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی-چوں کہ علامہ ارشد القادری صاحب کا انداز کچھ الگ تھا آپ میں جدت ہے، آپ جدید تقاضوں کے مطابق ان کے مشن پر کام کر رہے ہیں-اس کے علاوہ بھی ہندوستان سے رسالے ہمارے پاس آتے ہیں-وہ معیاری ہوتے ہیں ان میں جام نور ایک ایسا رسالہ ہے جس کا متبادل پاکستان میں نہیں ہے-آپ نے اہل سنت میں بیداری لانے کی کوشش کی ہے-اس پر آپ قابل مبارک باد ہیں-□□□

ڈاکٹر خواجہ اکرام☆

امریکہ نامہ

"مشرق و مغرب میں اخلاقیات، روحانیت اور دانش وری کی روایت" کے موضوع پر امریکہ میں ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت اور امریکی زندگی کے سماجی، اقتصادی اور مشینی پہلوؤں کی عینی شہادت کی روداد

امریکہ کا نام سنتے ہی بیک وقت کئی سوالات اور کئی باتیں ذہن میں آتی ہیں- یہ معاملہ صرف امریکہ کے ساتھ ہی ہے کیونکہ امریکہ آج کی دنیا کا سب سے طاقتور ملک ہے- شاید اسی طاقت کے سبب کمزور ممالک اس سے پریشان ہیں یا اگر پریشان نہیں ہیں تو اس سے خوف زدہ ضرور ہیں- اسی سبب امریکہ آج کی دنیا کا واحد ایسا ملک ہے جس کے لیے سب سے زیادہ نفرت پائی جاتی ہے- ایک نہیں کئی سروے سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے- دوسری بڑی حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی ایسا اخبار نہیں جس میں کسی نہ کسی طور پر امریکہ کے حوالے سے کوئی خبر نہ ہو- یہ اور اس طرح کی کئی ایسی باتیں ہیں جس کی وجہ سے امریکہ ہمیشہ چرچے میں رہتا ہے- موجودہ حالات کے پیش نظر اور مختلف رپورٹس کے حوالے سے بھی امریکہ اس لیے زیر بحث رہتا ہے کہ امریکہ کو ہی دہشت گردی سے آج سب سے زیادہ خطرہ ہے اسی لیے امریکہ اس کی مدافعت کے لیے ایسی اور اتنی احتیاطی تدابیر کرتا ہے کہ لوگوں کو اس سے اکثر پریشانی اور بدگمانی ہوتی ہے- خاص طور پر امریکہ جانے والے شوق میں امریکہ کا سفر ضرور کرتے ہیں لیکن ہر سفر کرنے والے کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ نجانے وہاں پہنچنے پر کس طرح کی تلاشی لی جائے گی اور کیا سلوک کیا جائے گا؟ کیونکہ اس طرح کی خبریں اکثر آتی رہتی ہیں کہ ہندستان کے کئی وزیروں کو بھی سخت تلاشی سے گزرنا پڑا ہے- امریکہ میں لی جانے والی تلاشی کے حوالے سے بھی طرح طرح کی خبریں دنیا میں سرگرم رہتی ہیں اور خاص طور پر مسلمانوں کے حوالے سے تو یہ خبر زیادہ ہی سرگرم رہتی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سختی کی جاتی ہے-

انھیں تمام واہموں اور اندیشوں کے ساتھ ہم نے بھی امریکہ جانے کا ارادہ کیا- 14 اپریل کی رات ہم، ڈاکٹر رضوان الرحمان اور ڈاکٹر اشتیاق جے این یو سے ڈیولیس اینڈ ایلکنس کالج، ویسٹ ورجینیا کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے- دل میں طرح طرح کے خیالات تھے اور ایک طرح کا خوف بھی تھا کہ نجانے کیا ہو؟ کئی احباب نے یہ بھی کہا تھا کہ امریکہ کا ویزا مل جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ امریکہ میں داخل بھی ہو جائیں گے- اصل مرحلہ تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب آپ ایئر پورٹ پر اترتے ہیں- خیر ہم اپنے طور پر مطمئن تھے- ڈاکٹر رضوان میرے اچھے دوست ہیں ہر طرح کی باتیں اُن سے شیئر کرتا ہوں لیکن میں نے اپنے دل کے خدشات کو ان سے کبھی ظاہر نہیں کیا-

امریکہ جانے کا میرا جو تجربہ ہے وہ ان اندیشوں سے بالکل الگ ہے- البتہ جس بات نے سب سے زیادہ بدحظ کیا وہ خود دہلی ایئر پورٹ پر ایئر انڈیا کے اسٹاف کا برتاؤ تھا- ہم تینوں احباب وقت سے تین گھنٹہ پہلے ہی ایئر پورٹ پہنچ گئے لیکن حیرت بھی ہوئی اور ہمیں غصہ بھی آ رہا تھا کہ چیک اِن کے لیے بیک وقت کئی کاؤنٹر کھلے ہوئے تھے لیکن وہاں جس طرح کے ناتجربہ کار اسٹاف موجود تھے وہ ایئر انڈیا کے لیے باعث شرم ہے- بلا مبالغہ ہم لوگ صرف ایک فیملی کے بعد تھے لیکن ہمارے اور ان کے چیک اِن میں ڈھائی گھنٹہ لگ گیا- ہم نے بار بار ان کے سنیئر سے شکایتیں بھی کیں لیکن لاحاصل- خیر یہ مرحلہ طے ہوا اس کے بعد امیگریشن کے لیے لائن میں لگے- یہاں ہم سے اتنی تفتیش ہوئی کہ کہاں جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟ کہاں رُکیں گے؟ کب واپس آئیں گے؟ اس کے بعد ہمارا دعوت نامہ دیکھا گیا، یونیورسٹی کا آڈر دیکھا گیا اس کے بعد خاتون امیگریشن آفیسر نے بادل نخواستہ ہمارے پاسپورٹ پر مہر لگائی- ان کارروائیوں میں اتنی دیر ہوئی کہ جہاز کی روانگی سے صرف پانچ منٹ پہلے ہم جہاز میں داخل ہو سکے

"امریکی اب مشینی زندگی سے پریشان سے ہو رہے ہیں اور بہتر زندگی کی تلاش میں صدیوں پرانی تہذیب کے حامل ممالک کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا مطالعہ بڑے انہماک سے کر رہے ہیں"

☆Associate Prof. Department of Urdu, CIL, JNU, New Delhi-khwajaekram@gmail.com

-لیکن ہماری طرح اور بھی کئی مسافر تھے، اس لیے پورے ایک گھنٹے تاخیر کے بعد تمام مسافر جہاز میں پہنچے تب جہاز روانہ ہوا-دہلی میں ایئر انڈیا اور امیگریشن آفیسر کے اس سلوک اور برتاؤ سے ہم بہت بدحظ اور پریشان ہوئے-اب رات کا ایک بج چکا تھا-بھلا ہو ڈاکٹر اشتیاق کا کہ انھوں نے کئی روز پہلے ہی ہم تینوں کے لیے فرنٹ رو کی سیٹیں ریزرو کرا لی تھیں اس لیے ہم لوگ بہت آرام سے بیٹھ گئے اور اب ذہن پہ یہ بار تھا کہ پندرہ گھنٹے کا سفر کیسے کٹے گا-لیکن ہم تین احباب تھے اس لیے باتوں باتوں میں سفر خوش گوار ہوتا جارہا تھا- ڈاکٹر اشتیاق سے اکثر خوش گپی بھی ہوتی رہی-یہ ہماری زندگی میں پہلی ایسی رات تھی جو بیں گھنٹے کی تھی-تقریباً بارہ ہزار کیلومیٹر کی دوری اور پانچ ٹائم زون سے گزرنا تھا-لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہم لوگوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا-ہندستان میں اس وقت شام کے پانچ بج رہے ہوں گے اور امریکہ میں اس وقت صبح کے ساڑھے سات بجے تھے- پرواز میں یہ اعلان ہوا کہ ہم اب جلد ہی نیویارک کے جان کنیڈی ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں-ہمارا اشتیاق بڑھا، سوچا نیویارک کا طائرانہ منظر دیکھ لیں لیکن اس قدر بادل اور کہرا تھا کہ اوپر سے کچھ نظر نہیں آیا، کچھ ہی لمحوں کے بعد ہمارا جہاز کینڈی ایئر پورٹ پر لینڈ کر گیا- کچھ ہی دیر میں ہم امیگریشن کاؤنٹر پر کھڑے تھے-یہاں پہنچ کر دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ اب نجانے یہاں کیا سلوک ہو؟ دل ہی دل میں ڈھیر ساری دعائیں پڑھیں -لیکن جو ہم نے سُنا تھا سب غلط ثابت ہوا-امیگریشن کاؤنٹر پر کوئی سوال نہیں پوچھا گیا اور نہ تلاشی کے لیے کسی مشین سے گزرنا پڑا-اس طرح ہم جلد ہی وہاں سے باہر نکلے چونکہ دو گھنٹے کے بعد واشنگٹن کے لیے فلائٹ لینا تھا، اس لیے باہر نکلتے ہی خود کار (بغیر ڈرائیور) میٹرو پر سوار ہوئے اور ٹرمنل سیون پر پہنچے- ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد یونائیڈ کی فلائٹ پر سوار ہوئے-جہاز دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ یہ چھوٹا جہاز تھا جس میں صرف 34 سیٹیں تھیں وہ بھی آدھی سے زیادہ خالی-خراب موسم کے سبب ہچکولے کھاتے تقریباً ایک گھنٹے میں ہم لوگ واشنگٹن ڈیلس ایئر پورٹ پہنچ گئے-یہاں ڈاکٹر لکھن گوسائیں کی اہلیہ ہمارے استقبال کے لیے موجود تھیں- ڈاکٹر لکھن گوسائیں جو جان ہاپکنس یونیورسٹی میں ساؤتھ ایشین لینگویج پروگرام میں ہندی اردو کے استاذ اور اور اس شعبے کے کارڈینٹر بھی ہیں، انتہائی مخلص دوست ہیں، جے این یو میں طالب علمی کے زمانے میں ہم ساتھ ساتھ تھے-بہت دنوں کے بعد ان سے ملنے کا اتفاق ہو رہا تھا-ہم بہت خوش تھے لیکن ہم سے زیادہ وہ لوگ خوش تھے-دہلی سے روانگی سے قبل ہی ان کے کئی فون آچکے تھے، انھوں نے بار بار ہمیں امریکہ کے سفر کے حوالے سے اہم ہدایتیں دیں-ان کی اہلیہ شیلی نے بھی کئی بار فون پر بات کی اور ہمارے منع کرنے کے بعد بھی وہ ایئر پورٹ آئیں- ان کے اس اخلاص کو دیکھ کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی کیونکہ امریکہ میں کہاں کسی کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے اور اگر کسی کے پاس وقت بھی ہوتا ہے تو وہ امریکی مزاج میں ڈھل جاتا ہے-لیکن ڈاکٹر لکھن اور ان کی اہلیہ تو بالکل نہیں بدلے تھے، وہی مشرقی مزاج اور انداز، مہمانوں کے استقبال کا وہی والہانہ انداز-یہ سب دیکھ کر ہمیں مشرقی تہذیب کی اہمیت کا اندازہ ہوا-دہلی سے نکلے ہوئے اب تک تیس گھنٹے سے بھی زائد ہو چکے تھے-شیلی نے جلدی سے ہمارے لیے کھانا تیار کیا اتنے میں ڈاکٹر لکھن یونیورسٹی سے گھر آگئے-ہم کچھ زیادہ ہی بھوکے تھے اس لیے کھانے پر ٹوٹ پڑے-کھانے سے فارغ ہو کر ہم گیسٹ روم میں آگئے-ہم تھکے ہوئے تھے اس لیے سوچا جلد ہی سو جائیں گے مگر ڈاکٹر لکھن سنگھ نے جو دلچسپ گفتگو شروع کی تو محفل زعفران زار ہو گئی-یونہی خوش گپیوں میں دوپہر سے شام ہو گئی-واشنگٹن میں یہ ہماری پہلی رات تھی سوچا کچھ چہل قدمی ہو جائے-یہ طے کیا گیا کہ ہم رات میں وائٹ ہاؤس دیکھیں گے کیونکہ ہم لوگوں کا قیام اسی 16 اسٹریٹ پر تھا جس پر وائٹ ہاؤس واقع ہے اور وائٹ ہاؤس قیام گاہ سے محض ایک دو کیلومیٹر کی دوری پر تھا-لہذا ہم باہر آئے لیکن اس قدر سرد ہوائیں چل رہی تھیں کہ ہمت نہیں ہوئی اور واپس گیسٹ ہاؤس آگئے-ہمیں بالکل بھوک نہیں لگی تھی لیکن شیلی اور ڈاکٹر لکھن کے اصرار نے مجبور کر دیا-ڈاکٹر رضوان اور اور ڈاکٹر اشتیاق تو نیند کے غلبے میں تھے لیکن میں ڈاکٹر لکھن کی دلچسپ گفتگو میں محو تھا-امریکہ کے حالات، امریکہ میں اردو ہندی تعلیم کے اداروں اور اساتذہ کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی-تقریباً دس سال سے لکھن امریکہ میں ہیں اس لیے امریکی تہذیب وتمدن پر ان کی گہری نظر ہے-ساتھ ہی ساؤتھ ایشیائی ممالک کے احوال پر بھی بڑی گہری نظر رکھتے ہیں-ان سے گفتگو کے بعد میری کئی غلط فہمیاں دور ہو گئیں-انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں تقریباً تمام ممالک کی زبانیں

پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں خاص طور پر ان ممالک کی زبان وتہذیب پر گہری نظر ہے جو ممالک آج سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے اہم ہیں- میں نے ایئر پورٹ پر ہونے والے سلوک اور تلاشی کے حوالے سے جاننا چاہا تو انھوں نے یہ بتایا کہ یہاں کی ایجنسیاں بہت باخبر ہوتی ہیں اس لیے ہر آنے والے کی انھیں پوری خبر رہتی ہے- باوجود اس کے جن پر ذرا بھی شبہ ہوتا ہے انھیں مزید تفتیش کے لیے روک لیتے ہیں- انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کی یہ پالیسی ہوتی ہے کہ ہر دو تین آدمیوں کے بعد کسی ایک کو وہ ضرور روک لیتے ہیں- اس کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہاں آنے والے نفسیاتی دباؤ میں رہیں- ان کی یہ بات ہمیں اس لیے بھی درست لگی کہ ہم لوگوں نے خود دیکھا کہ ہم سے آگے لائن میں کھڑے دو تین لوگوں کو کسی الگ روم میں لے جایا گیا اور تفتیش کی گئی- اس کے علاوہ جن پر انھیں کوئی شک ہوتا ہے یا کسی کے حوالے سے کوئی خبر رہتی ہے تو ملتے جلتے نام والے لوگ بھی تفتیش کے عتاب کا شکار ہوتے ہیں- امریکہ سے واپسی پر نیویارک ایئر پورٹ پر تلاشی کا ایک عبرتناک منظر دیکھنے کو ملا، ایک نوجوان کی سرعام جس طرح تلاشی لی جارہی تھی وہ بے عزتی سے کم نہیں تھی- بار بار طرح طرح سے تلاشی لی گئی- حالانکہ اس کے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوا- بعد میں معلوم ہوا کہ کسی اطلاع کی بنیاد پر اس کی یہ درگت ہوئی- حالانکہ ویزا دیتے وقت بھی امریکی ایمبیسیاں ہر طرح کا احتیاط برتتی ہیں- اکثر لوگوں کو مہینوں کے بعد ویزا ملتا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے میرے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوا- مجھے دوسرے دن ہی دس سال کا ویزا مل گیا- میری اور ڈاکٹر لکھن کی گفتگو طویل ہوتی جارہی تھی، میرے دوست ڈاکٹر رضوان اور ڈاکٹر اشتیاق صوفے پر ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے- ہمیں اس کا خیال بھی نہیں رہا اور ہم محو گفتگو تھے- ہندو پاک اور کئی اہم ممالک کے سفید پوشوں کی بات ہورہی تھی- یہ مذہبی اور سیاسی سفید پوشوں کی کہانی تھی کہ کس طرح وہ اپنے اپنے ملکوں کا سودا یہاں آکر کرتے ہیں اور اپنے ملک میں واپس جاکر سب سے بڑے محب وطن کہلاتے ہیں- یہ میری حیرت ہی تھی کہ میری آنکھوں سے نیند غائب ہوگئی کیونکہ وہ بڑے صحافی اور سیاسی لیڈران جو اپنے اصولوں کے لیے مشہور ہیں وہ کس طرح چند ڈالر کے عوض سب کچھ بیچ ڈالتے ہیں- اس گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ واقعی زمانہ بدل گیا ہے، معیار اور اصول اور ملک وقوم کے تئیں وفاداری اب دکھاوا ہے کیونکہ یہ وفاداری کا ٹھیکہ چلانے والے یہاں آکر اسی کا سودا کرتے ہیں- ہماری باتیں ختم نہ ہوتیں اگر ہم اپنے احباب کی جانب نہ دیکھتے، وہ تکلف میں کبھی آنکھ کھولتے اور بند کرلیتے -لہٰذا ہم نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا-

دوسرے دن شبلی کے ہمراہ ہم لوگ واشنگٹن ڈی سی کی سیر پر نکلے کیونکہ ڈاکٹر لکھن کو کلاس کے لیے یونیورسٹی جانا تھا اس لیے وہ دوپہر بعد ہم سے کسی خاص مقام پر ملنے کا وعدہ کرکے چلے گئے- دنیا بھر میں امریکہ کا وائٹ ہاؤس اپنے رعب ودبدبے کی وجہ سے مشہور ہے- اس لیے ہم نے سب سے پہلے وائٹ ہاؤس ہی دیکھنے کا فیصلہ کیا- جب ہم وائٹ ہاؤس کے قریب پہنچے تو اتفاق سے صدر امریکہ کا قافلہ گزر رہا تھا- قافلے کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ یہ براک اوبامہ ہیں کہ جب ہندستان گئے تو ہر طرف ان کی سیکیورٹی کا ہی چرچہ تھا اور سیکیورٹی کے نام پر کئی ہوٹل، کئی شاہراہ اور کئی مارکیٹ بند کرادیے گئے- لیکن یہاں تو سیکیورٹی کا وہ تام جھام نہیں تھا، چند پولیس کی گاڑیاں آگے پیچھے تھیں اور لوگ معمولی بریکیڈ کے پاس کھڑے تھے- ہم بھی وہیں یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور قافلہ گزرتے ہی بریکیڈ ہٹادیے گئے- ہم وائٹ ہاؤس کے بالکل نزدیک کھڑے اس ہاؤس کو دیکھ رہے تھے جس کا نقشہ ہمارے ذہنوں میں کچھ اور تھا، ہم نے سوچا تھا وائٹ ہاؤس کافی بڑا ہوگا، لیکن ہمیں مایوسی ہوئی کہ ساری دنیا پر حکمرانی کرنے والے کا قلعہ اتنا چھوٹا کہ ہمارے راشٹرپتی بھون کا ایک کونہ لگ رہا تھا لیکن میڈیا میں جس طرح اس کو دکھایا جاتا رہا ہے اس سے ہمارے ذہن میں یہ تصور تھا کہ کافی بڑا ہوگا، لیکن اسے دیکھ کر یہ بھی اندازہ ہوا کہ میڈیا کسی چیز کو کس طرح چھوٹا یا بڑا کرکے دکھا سکتا ہے-

واشنگٹن ڈی سی ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دارالحکومت ہے- اس کے نام کے آگے ڈی سی کا مطلب ''ڈسٹرکٹ آف کولمبیا'' ہے جو وفاقی ضلع ہے- واشنگٹن ڈی سی میں وائٹ ہاؤس، پینٹاگن، ورلڈ بینک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) اور آرگنائزیشن آف امریکن اسٹیٹس کے علاوہ مختلف ملکی وبین الاقوامی اداروں کے صدر دفاتر ہیں- اسی سبب یہ شہر بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے- اس کے علاوہ نیچرل سائنس میوزیم، آرٹ گیلری، نیشنل میوزیم آف امریکن انڈین نیشنل ایئر اینڈ اسپیس میوزیم قابل دید ہیں- ان کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ

ان کے پاس تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے کوئی قابل دید پرانی عمارتیں تو نہیں ہیں لیکن جدید انکشافات اور جدید تکنالوجی کو بڑے سلیقے سے انھوں نے میوزیم میں رکھا ہے جو تمام سیاحوں کے لیے باعث کشش ہے- ان کو دیکھ کر اپنے ملک کی سیر گاہوں کا خیال آیا کہ ہمارے پاس اتنا کچھ ہے مگر سیاحوں کو اٹریکٹ کرنے کا سلیقہ ابھی تک ہمیں نہیں آیا- خیر ہم نے نیشنل پارک میں واقع ان تمام مقامات کی جلدی جلدی سیر، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا کیونکہ اگر ہم لوگ صرف نیچرل سائنس میوزیم ہی قاعدے سے دیکھتے تو اس کے لیے کم از کم پورا ایک دن چاہیے تھا- لیکن ہمیں تو ایک ہی دن میں سب دیکھنا تھا- تقریباً تین بجے ڈاکٹر لکھن گوسائیں کا فون آ گیا- اس درمیان طفیل احمد صاحب کا کئی بار فون آ چکا تھا، وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے- ڈاکٹر لکھن کے ساتھ ہم لوگ ساؤتھ ایشیا اسٹڈیز پروجیکٹ کے ڈائریکٹر طفیل احمد صاحب سے ملنے ان کی آفس پہنچے- ان کے ساتھ ایک پنجابی ریسٹورینٹ میں دو پہر کا کھانا کھایا- یہ جے این یو میں ہمارے ساتھ تھے اس کے بعد وہ بی بی سی سے منسلک ہو گئے اور اب وہ واشنگٹن میں قیام پذیر ہیں- میڈل ایسٹ میڈیا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے متعلق انھوں نے تفصیلات بتائیں- یہ انسٹی ٹیوٹ بنیادی طور پر میڈل ایسٹ کے پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کی مانیٹرنگ کرتا ہے- خاص طور پر ان موضوعات کا باریکی سے جائزہ لیتے ہیں جن کا تعلق دہشت گردی سے ہوتا ہے- ان تفصیلات کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ کیوں اور کس طرح امریکہ دنیا کے حالات سے باخبر رہتا ہے اور اس کے لیے وہ کتنی خطیر رقم خرچ کرتا ہے - امریکہ دنیا سے باخبر رہنے کے لیے ہر طرح کی ترکیبیں اختیار کرتا ہے- اس کے سپر پاور ہونے میں یہ عنصر بھی بڑا ممد و معاون ہے- اس کے بعد ہم لوگ جان ہاپکنس یونیورسٹی گئے اور دیر تک اردو ہندی تعلیم کے نصاب اور طریقہ تعلیم پر بات چیت کرتے رہے- کچھ طلبہ و طالبات سے بھی ملاقات ہوئی ان سے بھی تبادلہ خیالات کیا- ان سے مل کر ان کی تعلیم کی سنجیدگی اور عزائم کو سن کر حیرت و استعجاب بھی ہوا کہ یہ لوگ کس دور اندیشی کے ساتھ اپنے کیریئر کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے کتنی جانفشانی کرتے ہیں- یہی وہ خاص باتیں ہیں جس کے سبب امریکہ دنیا میں اپنی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہے-

شام ہوتے ہی ہم لوگ ڈاکٹر لکھن صاحب کی ہمراہی میں گیسٹ ہاؤس آ گئے اور صبح کو کلارکس برگ جانے کے لیے واشنگٹن ایئر پورٹ پہنچے- ایلکنس، ویسٹ ورجینیا، جہاں کانفرنس ہوئی یہ علاقہ واشنگٹن سے کافی دور ہے- تقریباً دس گھنٹے کی ڈرائیو ہے- امریکہ میں دوری کا پیمانہ یہ ہے کہ کتنے گھنٹے کی ڈرائیو ہے- وہاں کی سڑکیں کشادہ اور ٹریفک کی الجھنوں سے دور ہیں- گاڑیاں 70 میل کی رفتار سے چلتی ہیں، لیکن ہمارے لیے حیرت یہ تھی کہ سوائے ہوائی جہاز کے کوئی پبلک ٹرانسپورٹ نہیں تھی- لہٰذا ہم نے بھی ہوائی جہاز سے ویسٹ ورجینیا جانے کے لیے کلارکس برگ تک کا سفر کیا- اس بار واشنگٹن ایئر پورٹ پر سیکورٹی سے گزرتے ہوئے اس مشین سے بھی گزرنا پڑا جس کے بارے میں دنیا کے تمام اخبارات میں ہنگامہ بپا ہوا تھا، لیکن ہم نے غور سے دیکھا کہ کیا اس مشین سے صرف غیر ملکی گزر رہے ہیں یا امریکی شہری بھی، لیکن بلا امتیاز یہاں سے سبھی کو گزرنا تھا- جوتے بھی کھولنے پڑے- اس مرحلے سے گزر کر ہم ایئر کرافٹ پر سوار ہوئے- اس روٹ پر چلنے والے زیادہ تر ہوائی جہاز چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ ۳۴ یا ۵۰ لوگوں کے لیے سیٹیں ہوتی ہیں- اسی طرح کے جہاز پر سوار ہو کر ہم نئے تجربات سے گزرے- ایئر کرافٹ میں صرف گیارہ لوگ تھے- کلارکس برگ سے پہلے مارگن ٹاؤن میں ایک اسٹاپیج تھا، یہاں تین لوگ اترے اور ایک خاتون سوار ہوئیں- ہمیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ مارگن ٹاؤن سے کلارکس برگ کی دوری کتنی ہے؟ جہاز کے پرواز بھرتے ہی پہاڑی سلسلے شروع ہوئے- خراب موسم کے سبب جہاز کچھ زیادہ ہی ہچکولے کھا رہا تھا اور ہماری روح فنا ہو رہی تھی- کبھی ہم ڈاکٹر رضوان کی جانب دیکھ رہے تھے تو کبھی وہ ہماری جانب اور ہم نے بڑے زوروں سے اپنی اپنی سیٹیں پکڑ رکھی تھیں- میں نے حیرت سے ڈاکٹر رضوان سے پوچھا بھائی یہ جہاز اونچائی پر کیوں نہیں جا رہا ہے- رضوان صاحب نے خوف کے لہجے میں کہا کہ کہیں کریش تو نہیں کرے گا؟ ہم بے حد ڈرے ہوئے تھے کیونکہ جہاز کو پرواز بھرے دس منٹ ہو چکے تھے اور یہ اونچائی کی جانب بڑھنے کے بجائے ہچکولے کھاتے پہاڑیوں سے گزر رہا تھا- اسی اثنا میں اچانک نیچے کو ڈرتے ہوئے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کلارکس برگ آ گیا- صرف دس منٹ کی فلائٹ یعنی دہلی سے نوئیڈا کی دوری تھی- اسی لیے مارگن ٹاؤن کے بعد یہ اونچائی پر نہیں گیا- خیر اللہ کا شکر تھا کہ ہم کلارکس برگ

پہنچ گئے- یہ ایک چھوٹا ایئر پورٹ تھا- وہاں سے ایلکنس تک جانے کے لیے کوئی پبلک سواری نہیں تھی- ہمارے لیے ایک گاڑی بھیجی گئی تھی جس سے ہم ڈیوس اینڈ ایلکنس کالج پہنچے- وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اگر ہمارے لیے گاڑی نہیں بھیجی گئی ہوتی تو ہمارا پہنچنا ناممکن تھا- معلوم یہ ہوا کہ دوسرے شہروں سے آنے والے لوگ ایئر پورٹ پر اتر کر کرائے کی کارلے کر جاتے ہیں- یہاں ہر جگہ آسانی سے پچاس ڈالر یومیہ کے حساب سے کار مل جاتی ہے- لیکن ہمارے لیے مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس انٹرنیشنل لائسنس بھی نہیں تھا اور نہ رائٹ ہینڈ ڈرائیونگ کا تجربہ اور نہ ہی اس پہاڑی سلسلے کے راستے سے واقفیت تھی- اس انداز کو دیکھ کر سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہاں کے تمام لوگوں کے پاس خود کی گاڑیاں ہوتی ہیں اسی لیے کسی پبلک ٹرانسپورٹ کی ضرورت نہیں- لیکن مشینی دور کا یہ انداز بھی بڑا اٹ پٹا لگا کہ ہم جیسے لوگ اگر یوں ہی بے یار و مددگار پہنچ جائیں تو کیا ہو؟ یہ شہر اپنی قدرتی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ روایتی اقدار کے لیے جانا جاتا ہے- لوگ بڑے نرم مزاج اور تحمل کے حامل ہیں- اس شہر کی آبادی تقریباً آٹھ ہزار ہے- تین دن کے قیام میں آس پاس جانے کا اتفاق ہوا مگر ایک حیرت مجھے اور ڈاکٹر رضوان کو ہمیشہ رہی کہ کسی گاڑی کے ہارن کی آواز نہیں سنی- لوگ انتہائی صبر و سکون سے گاڑی چلاتے ہیں اگر آپ کسی زیبرا کراسنگ پر کھڑے ہیں تو لوگ گاڑیاں روک دیتے ہیں- یہی حال نیویارک اور واشنگٹن میں دیکھا- لیکن نیویارک اور واشنگٹن کی زندگی اس سے مختلف ان معنوں میں تھی کہ یہ زیادہ ترقی یافتہ شہر ہیں، یہاں دنیا کی ساری سہولتیں موجود ہیں لیکن یہ تمام سہولتیں مشینوں پر منحصر ہیں- تقریباً تمام چیزیں خودکار ہیں- میٹرو، یا اسکائی ٹرین یا بس کسی بھی جگہ کام کرنے والے لوگوں کی جگہ مشینیں موجود ہیں- ایئر پورٹ کے ٹرمنل پر چلنے والی میٹرو اور اسکائی ٹرینیں بغیر ڈرائیور کے ہیں جو الیکٹرونک کمانڈ سے چلتی ہیں- گھر اور ہوٹل کے اندر کی تمام آسائشیں بھی مشینی ہی ہیں- اگر یہاں ایک دن کے لیے بجلی چلی جائے تو شاید یہاں کی زندگی ہی رک جائے- اسی انداز زندگی نے لوگوں کو مشینی بنا دیا ہے اور سوچنے سمجھنے کا انداز بھی مشینی ہو گیا ہے- لوگوں کو انسان سے زیادہ مشین پر ہی بھروسہ ہے اور یہی ان کا سہارا بھی ہے- اسی لیے دنیا کے تمام برقی اور معدنی ذرائع کا استعمال کرنے کے اعتبار سے امریکہ اور یوروپ کے کئی ممالک پہلے نمبر پہ ہیں جو ایک اعتبار سے دنیا کے لوگوں کے ساتھ ناانصافی بھی ہے-

اسی مشینی زندگی نے لوگوں کو انسان کی طاقت وقوت کو سمجھنے کی کوشش بھی چھین لی ہے- ان کے اس رویے نے انسانی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا کیا ہے کہ اب کچھ لوگ پیچھے کی جانب مڑ کر دیکھنے لگے ہیں- یہ سیمنار بھی اسی فکری سلسلے کی ایک کڑی تھا- ایلکنس، ویسٹ ورجینیا، امریکہ میں منعقدہ ایک کانفرنس (7 تا 10 اپریل 2011) میں ہندستان سے ہم، ڈاکٹر رضوان اور ڈاکٹر اشتیاق تین لوگ شریک ہوئے، امریکہ کے مختلف اسٹیٹس کے علاوہ کئی ممالک کے دانشوروں نے بھی شرکت کی- اس کانفرنس کا بنیادی موضوع ''مشرق و مغرب میں اخلاقیات، روحانیت اور دانشوری کی روایت'' تھا- مختلف احباب نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا اپنے مقالے میں احاطہ کیا- کسی نے سائنس کی موجودہ ترقی کے دور میں اخلاقیات کے گم ہوتے مسائل پر بات کی تو کسی نے روحانیت کے حوالے سے مشرق و مغرب کی روایتوں کا جائزہ لیتے ہوئے انسان شناسی اور انسان دوستی کا حوالہ پیش کیا- تین دن کی اس کانفرنس میں مجموعی طور پر انسانی اقدار کی تلاش و جستجو اور عہد حاضر کے ثقافتی اور تہذیبی انتشار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو ہوئی- اس کانفرنس کی تفصیل سے قبل اگر امریکی زندگی کے چند پہلوؤں پر غور کر لیا جائے تو اس کے اغراض و مقاصد کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے- اس سیمنار میں جس طرح کے مقالے پڑھے گئے اس سے حیرت ہوئی کہ زیادہ تر لوگوں نے برصغیر ایشیا اور بالخصوص ہندستانی فکر و فلسفے کو اپنا موضوع بنایا- خاص طور پر صوفیہ کرام کی زندگی ان کے اصولوں اور ہندستانی موسیقی کے علاوہ گوتم بودھ اور ہندو میتھالوجی پر گفتگو کی- اندازہ یہ ہوا کہ لوگ اب تہذیبی زندگی کی تلاش میں مشرق کی جانب دیکھ رہے ہیں- اس کانفرنس میں شریک ہونے والے امریکی اساتذہ کے علاوہ وہ ہندستانی اساتذہ بھی شامل تھے جن کا تعلق ہندستان سے تھا، اگرچہ اب وہ امریکی شہری ہیں- ان سے ذاتی گفتگو کے دوران یہ احساس ہوا کہ لوگ اس مشینی زندگی سے پریشان سے ہو رہے ہیں اور بہتر زندگی کی تلاش میں صدیوں پرانی تہذیب کے حامل ممالک کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا مطالعہ بڑے انہماک سے کر رہے ہیں- لیکن افسوس یہ ہوا کہ ان کے پاس ریفرنس کے لیے جو کتابیں ترجمے کی شکل میں موجود ہیں وہ ناقص اور نامکمل ہیں- مجھے اس ضرورت کا شدت سے احساس ہوا کہ

ہمارے ملک کی تہذیب وتمدن پر بہتر اور مستند کتابوں کا ترجمہ اور اس کی اشاعت مغربی ممالک کی موجودہ ضرورت بنتی جارہی ہے اس لیے ہمارے ملک کے دانشور اگر اس جانب توجہ دیں تو ہماری تہذیب وثقافت کو لوگ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں- کیونکہ کئی مقالوں میں جو حوالے دیے گئے تھے وہ یا تو غلط تھے یا ناقص اور یہ قصور ان کا نہیں تھا بلکہ کتابوں کی عدم دستیابی کے سبب تھا- بہر کیف وہاں جاکر تکنیکی ترقی کے اعتبار سے تو نہیں لیکن تہذیبی رنگارنگی کے اعتبار سے ہمیں اپنے ملک پر فخر کا احساس ہوا- انھیں اقدار کی کمی کے سبب ان ممالک میں انسان گم ہوتے جارہے ہیں- آج کی دنیا ایک طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیات کے اعتبار سے بام عروج پر ہے تو دوسری جانب لوگ ان ترقیات کے پس منظر میں گم ہوتے ہوئے انسان اور انسانیت کی جانب بھی تشویش بھرے انداز میں دیکھنے لگے ہیں- دراصل سائنسی ترقیات ہماری زندگی میں انقلاب انگیز تبدیلیاں لے کر آئی ہیں- ان تبدیلیوں کا سیدھا اثر ہماری شب وروز کی زندگی پر مرتب ہوئی- زندگی اتنی آسان ہوگئی کہ ہم نے ان ٹکنالوجی کو اپنی زندگی کا لازمہ بنالیا اور گردوپیش کو بھی اسی عینک سے دیکھنے لگے- یہ بات اگرچہ ہم ہندستانیوں کی زندگی پر مکمل طور پر صادق نہیں آتی لیکن امریکی زندگی کو دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ لوگ مشینی دور میں خود بھی مشین بن گئے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار بھی انھیں مشینوں پر ہے-

امریکی زندگی کے حوالے سے کچھ نئی باتوں کا انکشاف ہوا- ایک بات جو بڑی اچھی لگی وہ یہ کہ ہم لوگ ڈیوس اینڈ ایلکنس کالج کے جس 'گریس لینڈ ان' میں ٹھہرے ہوئے تھے وہ ایک تھری اسٹار ہوٹل کے برابر کی سہولیات کا حامل تھا- معلوم یہ ہوا کہ اس کالج میں ہوٹل مینجمنٹ کی تعلیم ہوتی ہے اور یہاں پڑھنے والے طلبہ وطالبات ہی اس کا پورا مینجمنٹ سنبھالتے ہیں- سارا کام انھیں کے ذمے ہوتا ہے- اس طرح ان کی یہ پریکٹیکل ٹریننگ بھی ہوجاتی ہے اور گیسٹ ہاؤس کو کسی طرح کا اقتصادی بوجھ بھی نہیں ہوتا ہے- شاید ہمارے یہاں کے طالب علم اس کو کسی طرح گوارا نہیں کریں- لیکن یہ وہاں کی تہذیب کا حصہ ہے کہ کوئی کچھ بھی کام کرے ان کے لیے باعث شرم نہیں کیونکہ بہت سے طلبہ چھٹیوں میں کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کام کرلیتے ہیں، خود اس کالج کی شاندار کینٹین میں ہم لوگوں نے دو تین وقت کا کھانا کھایا جو ایک اچھے ہوٹل کے کھانے سے کسی طرح کم نہیں تھا- معلوم یہ ہوا کہ کچھ طلبہ و طالبات یہاں پارٹ ٹائم کام کرتے ہیں- یہ ان کے لیے شرم کا سبب نہیں- کینٹین کا انتظام بھی ایسا کہ ہر طرح کے کھانے اور مشروبات موجود تھے- خود سے کھانا لینا ہے اور کھانے کے بعد پلیٹیں بھی اٹھا کر متعینہ جگہ پر رکھنا ہے- اس طرح بہت سے طالب علم اس کینٹین میں جز وقتی کام کرکے اپنی تعلیم کا خرچ نکالتے ہیں- اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں اسکولوں میں پڑھنے والے تمام طلبہ وطالبات کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کمیونٹی سروس کریں- یہ ان کے کریکولم (تعلیمی سرگرمیوں) کا حصہ ہوتا ہے- وہ طالب علم جو کمیونٹی سروس میں حصہ نہیں لیتے ان کو سرکاری نوکریاں ملنی مشکل ہوتی ہیں- اس کمیونٹی سروس میں جھاڑو دینے سے لے کر صفائی ستھرائی کا کوئی بھی کام ہوسکتا ہے- یہ پہلو ہمیں بہت اچھا لگا کہ جہاں ہم پڑھتے ہیں وہاں کسی کام کو کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنی چاہیے اور یہ ہماری مستقبل کی زندگی کی ٹریننگ بھی ہوتی ہے-

ہماری تہذیب سے جو چیز بالکل منفرد تھی وہ یہاں کی آزادانہ زندگی- جہاں لڑکے لڑکیوں کا بے تکلف اختلاط ہر جگہ نظر آیا- ظاہر ہے یہ ان کی زندگی کا حصہ ہے- لیکن یہاں بھی ایک بات نظر آئی وہ یہ کہ جو لوگ روایتی عیسائی ہیں، ان کے یہاں مشترکہ زندگی کی کچھ جھلک ملتی ہے- وہ اپنی بچیوں کی شادیاں جلد ہی کردیتے ہیں- ہمیں ایئرپورٹ پر جو خاتون لینے آئی تھیں وہ ریسرچ اسکالر تھیں، ان کی عمر تیس سے بھی کم تھی اور وہ شادی شدہ تھیں- ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ان کے یہاں ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کا خیال ہے- حالانکہ ہمارا یہ عام تصور ہے کہ امریکہ میں بچے بڑے ہوتے ہی اپنے من کے مالک ہوتے ہیں- ایسا ضرور ہے لیکن روایتی قسم کی فیملی کچھ مختلف ہے- وہاں گیسٹ ہاؤس میں ایک پمفلیٹ دیکھنے کو ملا جس کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں لڑکے لڑکیاں اپنے ساتھی کا انتخاب خود کرتی ہیں اور اس میں کوئی سماجی برائی نہیں- کسی دوست کے ساتھ ڈیٹ پر جانا اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا اس کے بعد یہ طے کرنا کہ ان کے ساتھ شادی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ ہمیں اس وقت اور حیرت ہوئی کہ ایک ہندستانی پروفیسر نے اپنی بیٹی کے بارے میں بتایا کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑے اچھے عہدے پر فائز ہے لیکن ہمارے کہنے کے باوجود وہ ڈیٹ پر جانے کا وقت نہیں نکال پا رہی ہے- ان کی اس بات سے بھی اندازہ ہوا کہ یہ آزادی امریکی زندگی کا حصہ ہے- خیر ہم اس پمفلیٹ کا ذکر کررہے تھے جو پولیس انتظامیہ کی

جانب سے تھا جس کے سرورق پر لکھا تھا Dating Violence اور اندرونی صفحات پر بہت سی تاکیدیں لکھی ہوئی تھیں جو ڈیٹنگ کے اصولوں کے مخالف ہو سکتی ہیں۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ڈیٹنگ کے بہانے بہت سے کرائم بھی ہوتے ہیں اور اس کے کئی اصول بھی ہیں۔ یعنی ڈیٹنگ پر گئی لڑکی کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے کسی بات کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور کئی طرح کی ہدایات اس میں درج تھیں۔ بہرکیف یہ ان کی تہذیب کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ ان میں اور مشرقی تہذیب میں جو نمایاں فرق نظر آیا وہ یہ کہ وہ مہمانوں کا استقبال بھی مصنوعی انداز میں کرتے ہیں۔ جو لوگ ان کے انداز سے واقف نہیں ہیں انھیں بڑی مایوسی ہوگی کیونکہ ہم مہمانوں کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں لیکن وہ ہماری طرح مہمانداری اور ضیافت نہیں کرتے۔ ہاں ایک بات جو مجھے بہت اچھی لگی وہ یہ کہ جس طرف نکلیں کوئی بھی مل جائے وہ آپ کو ہیلو ضرور کہے گا اور جواب میں مسکرائے گا۔ حالانکہ یہ ہماری تہذیب ہے کہ کسی سے ملو تو سلام میں پہل کرو لیکن ہم اپنی تہذیب بھولتے جا رہے ہیں۔ خیر تین دن کے سیمینار کے بعد ہم نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔

اس سفر میں امریکہ کے تین شہروں ویسٹ ورجینیا، واشنگٹن اور نیویارک کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان تینوں شہروں کی خاص بات یہ ہے کہ تینوں شہروں کی زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھی۔ ورجینیا روایتی طرز کا شہر ہے۔ واشنگٹن سیاسی سرگرمیوں کا شہر اور نیویارک مختلف تہذیب وثقافت کا شہر ہے۔ نیویارک ریاستہائے متحدہ امریکہ کا سب سے بڑا شہر ہے اور دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے جو دریائے ہڈسن کے کنارے واقع ہے۔ نیویارک کاروبار، تجارت، فیشن، طب، تفریح، ذرائع ابلاغ اور ثقافت کا عالمی مرکز ہے جہاں کئی اعلیٰ نوعیت کے عجائب گھر، آرٹ گیلریاں، تھیٹر، بین الاقوامی ادارے اور کاروباری مارکیٹیں ہیں۔ اقوام متحدہ کا صدر دفتر بھی اسی شہر میں ہے جبکہ دنیا کی کئی معروف بلند عمارات بھی اسی شہر کی زینت ہیں۔ یہ شہر دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے باعث کشش ہے۔ 1952 میں اقوام متحدہ کے دفاتر کے قیام نے اسے دنیا بھر کے شہروں پر سیاسی برتری دلائی۔ نیویارک 11 ستمبر 2001 کو دہشت گردانہ حملوں کا نشانہ بنا اور شہر کی بلند ترین عمارت ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے تباہ ہونے سے اس کی شہرت اور بھی بڑھ گئی۔ وکی پیڈیا کے مطابق ”نیویارک کو دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کا دارالحکومت بھی کہلاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی دنیا میں عالمی معروف ادارے اور ٹائمز اسکوائر، ٹائم وارنر، نیوز کارپوریشن، ہیرسٹ کارپوریشن اور وایاکوم اسی شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ دنیا بھر کی آزاد فلموں میں سے ایک تہائی نیویارک میں پیش کی جاتی ہیں۔ 200 سے زائد اخبارات اور 350 جرائد کے دفاتر شہر میں موجود ہیں۔ صرف کتب کی طباعت واشاعت کی صنعت سے ہی 13 ہزار افراد وابستہ ہیں۔ شہر امریکہ کے 4 بڑے نشریاتی ٹیلی وژن اداروں اے بی سی، سی بی ایس، فوکس اور این بی سی اور دیگر کئی معروف کیبل ٹیلی وژن چینلوں بشمول ایم ٹی وی، فوکس نیوز، ایچ بی او اور کامیڈی سینٹرل کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ انگریزی کے علاوہ اردو کے کئی ہفتہ وار اخبار بھی نیویارک سے شائع ہوتے ہیں۔ نیویارک شہر بین الاقوامی کاروبار اور تجارت کا عالمی مرکز سمجھا جاتا ہے اور اسے عالمی اقتصادیات کے تین مراکز نیویارک، لندن اور ٹوکیو میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے۔ تجارت، انشورنس، رئیل اسٹیٹ، ذرائع ابلاغ اور آرٹس کے علاوہ شہر کے دیگر اہم شعبہ جات میں ٹیلی وژن اور فلم انڈسٹری، طبی تحقیق اور ٹیکنالوجی، غیر منافع بخش ادارے اور جامعات اور فیشن شامل ہیں۔ نیویارک شہر پانچ علاقوں پر مشتمل ہے: مین ہٹن، بروکلن، کوئنز، برونکس، اسٹیٹن جزیرہ۔ یہ پانچوں علاقے انتہائی گنجان آباد ہیں جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر انہیں الگ شہر بھی سمجھا جائے تو یہ تمام دنیا کے 50 گنجان آباد ترین علاقوں میں شامل ہوں گے۔“

ہم لوگ نیویارک میں مین ہٹن کے ڈاؤن ٹاؤن علاقے میں ایک ہوٹل میں رکے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ہی ہم لوگوں نے اس ہوٹل کو بک کرایا تھا۔ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ اس کے منیجر ہندستانی ہیں اور دہلی کے لاجپت نگر کے رہنے والے ہیں۔ جب ہم یہاں پہنچے تو رات کا ایک بج چکا تھا۔ موسم سرد تھا اور ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ ہوٹل میں کھانے کا کچھ انتظام نہیں تھا اس لیے ہم لوگ باہر آئے۔ دوسری اسٹریٹ پر ایک میکڈونل پہنچے لیکن کھانے میں کوئی چیز سبزی کی نہیں تھی، کچھ برگر تھے بھی تو اس میں بھی گوشت کی آمیزش تھی جو حلال نہیں تھا، ہمارے بار بار حلال پوچھنے پر اس نے ڈیلنسی اسٹریٹ پر ساہیوال ڈیلی کا پتہ بتایا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں خوشی ہوئی، دوکان مالک بھائی عبدالماجد بڑے تپاک سے ملے اور ہفتوں کے بعد دال، چاول اور گوشت دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور کھانے کا مزہ بھی آیا ——— بقیہ صفحہ 17 پر ملاحظہ کریں

منظر الاسلام ازہری ☆

حدیث "اطلبو ا العلم" کا تحقیقی تجزیہ

"تقریروں میں موضوع روایات" کے سلسلے میں ہم اب تک کئی تحریریں شائع کر چکے ہیں، جس میں صاحب مضمون کی حمایت اور مخالفت دونوں طرح کی تحریریں شامل ہیں کہ یہی غیر جانب دار اور دیانت دار صحافت کا تقاضا بھی ہے، لیکن یہ بحث اب طوالت اختیار کرتی جا رہی ہے، لہٰذا منظر الاسلام ازہری کے اس مضمون کے ساتھ ہم اب یہ سلسلہ بند کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

چند ماہ پہلے مولانا اسید الحق قادری بدایونی کا تحقیقی مضمون "تقریروں میں موضوع روایتیں" دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اہل علم نے اس کو توجہ اور دلچسپی سے پڑھا اور اس پر ملا جلا ردعمل سامنے آیا، بعض اہل علم نے مضمون سے متعلق اپنے تحفظات کا علمی اور سنجیدہ اسلوب میں اظہار کیا تو دوسری طرف بعض لوگوں نے اس مضمون کو مولانا اسید الحق کی طرف سے اہل سنت و جماعت، مشائخ تصوف اور اکابر علمائے ہند کے خلاف ایک کوشش قرار دیا۔ جام نور کے بعض قارئین نے بھی تائید، تردید اور تشویش کے خطوط لکھے جو اظہار خیالات کے کالم میں شائع بھی ہوئے۔ فروری ۲۰۱۱ء کے اظہار خیالات کے کالم میں حضرت مولانا رضوان احمد شریفی صاحب کا طویل تحقیقی مراسلہ "حدیث اطلبوا العلم ولو بالصین انتہائی ضعیف یا موضوع نہیں" شائع ہوا، اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا نے سنجیدہ اور علمی اسلوب میں اپنی بات بڑے سلیقے سے کہی ہے، مگر اس تحریر میں کئی مقامات مزید تحقیق طلب ہیں اور کلام کی گنجائش ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں جو کچھ مطالعہ کیا اس کا خلاصہ ہدیہ قارئین ہے۔

زیر بحث حدیث کا کامل متن پوری سند کے ساتھ:

أطلبوا العلم ولو بالصين

تخریج: یہ حدیث درج ذیل علماء اور محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں بعینہ انہی لفظوں کے ساتھ یا کچھ اضافہ کے ساتھ نقل کی ہے:

مسند بزار، ۱/۱۷۵، حدیث نمبر ۹۵/ الفردوس بماثور الخطاب، ۱/ ۷۸عن انس/ شعب الایمان، ۲/۲۵۳، حدیث نمبر ۱۶۶۳، عن انس/ المدخل الی السنن الکبری ۱/۲۴۱، حدیث نمبر ۳۲۴، عن انس/ التدوین فی أخبار قزوین، ۱/۴۹۲، عن انس/ تاریخ بغداد، ۹/۳۶۳، تذکرہ نمبر ۴۹۳۱، عن انس/ الرحلۃ فی طلب الحدیث ۱/۷۲، ۱/۷۵، ۱/۷۶ عن انس/ میزان الاعتدال فی نقد الرجال ۱/۲۴۵، تذکرہ نمبر ۶۱۸۴۲۰، عن ابی حریرۃ/ الکامل فی ضعفاء الرجال ۱/۱۷۷، تذکرہ نمبر ۱۷ عن ابی ہریرہ، ۴/۱۱۸، عن انس، تذکرہ نمبر ۹۶۳/ الضعفاء للعقیلی ۲/۲۳۰، تذکرہ نمبر ۷۷۷ عن انس/ المجروحین ۱/۳۸۲، تذکرہ نمبر ۵۱۷ عن انس/ التدوین فی اخبار قزوین ۱/۴۹۲، عن انس/ کشف الخفاء ۱/۱۵۴، ۲/۵۶۔

اس حدیث کو مذکورہ تمام محدثین نے اپنی کتابوں میں یا تو حضرت انس بن مالک (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) یا حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے طریقہ پر درج کیا ہے، لہٰذا حدیث کا مخرج دو ہی ہے۔ حضرت انس والی روایت کا تذکرہ ابن جوزی نے موضوعات میں تین مرتبہ کیا ہے پہلی دو سندیں حسن بن عطیہ کوفی، ابو عاتکہ بحوالہ انس بن مالک ہیں۔ حسن بن عطیہ کے تفرد سے متعلق حاکم کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا کہ تفرد کا قول درست نہیں ہے کیونکہ ایک روایت میں حسن کی جگہ حماد بن خالد ہیں۔ اخیر میں حضرت انس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) والی روایت پر اس طرح حکم لگایا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، حسن بن عطیہ کو ابو حاتم نے ضعیف کہا ہے، ابو عاتکہ کو بخاری نے منکر الحدیث کہا اور ابن حبان نے کہا اس حدیث کی کوئی اصل نہیں۔

حضرت انس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) والی اس سند کے بارے میں بزار (۲۱۵-۲۹۲ھ) نے کہا ابو عاتکہ کی حدیث "اطلبو العلم ولو بالصین" ہے۔ لا يعرف ابو عاتكه ولا يدرى من أين هو فليس لهذا الحديث أصل - ابو عاتکہ غیر معروف ہیں، وہ کہاں سے تعلق رکھتے ہیں اس کا بھی کچھ پتہ نہیں، لہٰذا اس حدیث کی کوئی اصل نہیں۔

علامہ بیہقی (۳۸۴-۴۵۸ھ) اس سند کے بارے میں فرماتے ہیں: هذا الحديث مشهور، واسناده ضعيف، وقد روى من أوجه كلها كمال - یہ حدیث مشہور ہے، اس کی سند ضعیف ہے اور

☆Islamic Association of Carry, North Carolina, USA-email:manz786@gmail.com

اس کے مختلف طرق ہیں جو درجہ کمال پر ہیں۔
المدخل میں بھی اس عبارت کو دہرایا اور اس قدر اضافہ کے ساتھ کہا: لا أعرف له اسنادا یثبت بمثله الحدیث، والله أعلم۔
اس طرح کی کوئی سند میرے علم میں نہیں جس سے حدیث کا ثبوت ہوسکے۔

علامہ ذہبی نے میزان ۳۵۹/۲ میں طریف بن سلیمان ابوعاتکہ عن انس کی سند کے بارے میں محدثین کا یہ ریمارک درج کیا:

قال أبو حاتم ذاهب الحدیث۔ ابوحاتم نے کہا وہ (ابو عاتکہ) ذاہب الحدیث ہے۔

وقال البخاری: منکر الحدیث۔ بخاری نے کہا وہ (ابو عاتکہ) منکر الحدیث ہے۔

وقال النسائی: لیس بثقة۔ نسائی نے کہا وہ (ابوعاتکہ) ثقہ نہیں۔

وقال الدارقطنی وغیره: ضعیف۔ دارقطنی نے کہا وہ (ابوعاتکہ) ضعیف ہے۔

پھر تنقیدی انداز میں کہتے ہیں: قلت: هو صاحب حدیث أطلبو العلم ولو بالصین یہی ہیں جن سے حدیث اطلبو العلم. مروی ہے۔

علامہ ابن حجر نے بھی لسان المیزان ۱۹۳/۱ میں ابو عاتکہ کے تذکرہ کے تحت ذہبی کی عبارت نقل کی ہے

خطیب (۳۹۳-۴۶۳) نے امام بخاری کے حوالہ سے کہا: طریف بن سلیمان أبو عاتکه سمع أنس بن مالک "طلب العلم فریضة" منکر الحدیث، قلت وحدیث طلب العلم رواه عن ابی عاتکة الحسن بن عطیة، ولا أعلم رواه عنه أبو الحسن علی بن ابی بکر الطرازی بنیسابور.

ابن عدی نے اس طرح لکھا: قال الشیخ قوله "ولو بالصین" ما أعلم الحسن بن عطیة عن ابی عاتکة عن انس.
شیخ نے کہا "ولو بالصین" کے اضافہ کے ساتھ مجھے نہیں معلوم کہ حسن بن عطیہ نے عن ابی عاتکہ عن انس کے حوالہ سے روایت کیا۔

عقیلی نے کہا: لا یحفظ "ولو بالصین" الا عن ابی عاتکة، وهو متروک الحدیث۔

ولو بالصین کا اضافہ صرف ابوعاتکہ کے ہی حوالے سے ہے اور وہ متروک ہیں۔

حضرت انس کے ہی حوالے سے ایک دوسری سند کا تذکرہ ابن عبدالبر نے کتاب العلم میں یعقوب بن اسحاق عسقلانی عن عبید الله فریابی، عن ابی محمد زہری عن انس بن مالک کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔
ابن حجر نے یعقوب بن اسحاق کے بارے میں ذہبی کا یہ قول "کذاب" نقل کیا ہے (لسان المیزان ۳۰۴/۶، تذکرہ نمبر ۱۰۹۰) اس کے بعد ابن عبدالبر کا حوالہ ذکر کیا۔

حضرت انس کے ہی حوالے سے ابن عبدالبر نے ایک دوسری سند کا ذکر کیا ہے، جس میں ابراہیم نخعی نے حضرت انس سے اپنے سماع کا ذکر کیا۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ ابراہیم نخعی کا سماع انس سے ثابت ہی نہیں۔

اس کی ایک سند ربیع بن حبیب نے اپنی مسند میں ابوعبیدہ، عن جابر بن یزد، عن انس بن مالک کے طور پر ذکر کیا ہے۔ (مسند ربیع ۲۹/۱)
اس مسند کی حقیقت ہی مشکوک ہے، بعض محدثین کی تحقیق کے مطابق یہ اباضیوں کی من گھڑت ہے۔

دوسری سند جو ابو ہریرہ کے حوالے سے ہے اس اس میں احمد بن عبد الله جویباری ہیں، ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے ان کے بارے میں محدثین کا قول اس طرح نقل کیا: قال ابن عدی کان یضع الحدیث لابن کرام علی ما یریده، فکان ابن کرام یخرجها فی کتبه عنه۔
ابن عدی نے کہا وہ ابن کرام کے لیے حدیثیں گڑھا کرتا تھا اور ابن کرام اس کی حدیثوں کو اپنی کتاب میں درج کرتے تھے۔

وقال ابن حبان هو أبو علی الجویباری دجال من الدجاجلة، روی عن الأئمة ألف حدیث ما حدثوا بشئی منها۔ ابن حبان نے کہا ابوعلی جویباری ایک دجال ہے، ائمہ کرام کے حوالے سے ہزاروں حدیثیں اس نے من گھڑت بنالی ہیں۔

وقال النسائی والدارقطنی کذاب۔
نسائی اور دارقطنی نے کہا وہ کذاب ہے۔

قلت: الجویباری ممن یضرب المثل بکذبه۔
ذہبی کہتے ہیں کہ یہ تو ان لوگوں میں سے ہے جن کے جھوٹ کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

کچھ آگے چل کر امام بیہقی کے حوالے سے لکھتے ہیں: جویباری نے محمد بن عبد اللہ فلسطینی عن جویبر عن الضحاک عن ابن عباس کے طریقہ سے عبد اللہ ابن سلام کے مسئلوں میں سے تقریبا ایک ہزار مسئلہ کا ذکر کیا۔ فلسطینی نے کہالا یعرف اور جویباری متروک ہیں۔ بیہقی کہتے ہیں کہ میں جویباری کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ رسول کریم ﷺ کے بارے میں موضوع روایتیں گھڑا کرتا تھا اور ایک ہزار سے زیادہ حدیثیں اس کی من گھڑت ہیں۔

امام حاکم کے حوالے سے لکھا کہ یہ بڑا جھوٹا اور خبیث تھا، اس نے فضائل اعمال میں بہت حدیثیں گھڑی ہیں، اس کی بیان کردہ حدیثوں کی روایت کسی طرح بھی درست نہیں

ابن عدی نے ابو ہریرہ والی سند کا تذکرہ کیا اور کہا: وهذا بهذا الاسناد باطل برويه الحسن بن عطية عن ابى عاتكة عن انس و ابو البخترى المذكور.

خلاصہ کلام یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک یہ حدیث دو ہی طریقے حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور حضرت انس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے حوالے سے مروی ہے۔ حضرت انس والی روایت کا مدار ابو عاتکہ، حسن بن عطیہ یا یعقوب بن اسحاق پر ہے اور ان تینوں کے بارے میں محدثین کا نظریہ آپ نے پڑھ لیا۔ حضرت ابو ہریرہ والی سند کا مدار جویباری پر ہے جس کے کذاب ہونے میں محدثین کو کچھ شک نہیں۔ تیسری غیر معروف سند ربیع کی مسند میں ہے جو کتاب ہی سرے سے مشکوک ہے۔ حضرت انس والی روایت کے انتہائی ضعف ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے راوی ابو عاتکہ کے بارے میں محدثین نے ذاهب الحدیث، منکر الحدیث، غیر ثقہ، متروک الحدیث اور ضعیف ہے جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ الفاظ جرح کے مراتب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ''منکر الحدیث اور ضعیف'' کے علاوہ تمام الفاظ جرح کے تیسرے مرتبہ میں ہیں جو مرتبہ کہ ''متہم بالوضع اور متہم بالکذب'' کا ہے۔ منکر الحدیث کا استعمال امام بخاری نے کیا ہے، عام قاعدہ کے مطابق تو اس لفظ کا پانچواں درجہ ہے، جس سے متصف راوی کی حدیث کا اعتبار کیا جاتا ہے مگر جب امام بخاری اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں تو ان کے نزدیک اس سے متصف راوی کی حدیث قابل احتجاج نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے روایت کرنا جائز ہوتا ہے۔

الفیہ میں جرح کے اس درجہ اور اس کے الفاظ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، ''متروک'' کی شرح کے تحت امام شعبہ کا یہ قول نقل کیا: قال ابن مهدى: سئل شعبة من الذى يترك حديثه؟ قال: من يتهم بالكذب، ومن يكثر الغلط.

ابن مہدی نے کہا شعبہ سے پوچھا گیا کہ کس طرح کے راوی کی حدیث کو ترک کرنے کا حکم ہے؟ جواب دیا جس پر جھوٹ بولنے کی تہمت لگی ہو اور جس سے بہت زیادہ غلطی واقع ہوتی ہو۔

کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں: لكن قال البخارى: كل من قلت فيه منكر الحديث يعنى الذى أدرج فى الخامسة لا يحتج به، وفى لفظ لا تحل الرواية عنه (فتح المغيث شرح الفية الحديث، للسخاوى ١/٣٧٣)

امام بخاری نے کہا کہ میں جس کے بارے میں منکر الحدیث (جو گرچہ پانچواں درجہ ہے) کہوں اس سے روایت جائز نہیں۔

ایک سند میں یعقوب بن اسحاق ہیں ان کو بھی علما نے کذاب کہا۔ حضرت انس کی تیسری شاخ جس میں ابراہیم نخعی ہیں، ابن حجر کے مطابق ان کا سماع انس سے ثابت ہی نہیں۔ لہذا اس سند کے اعتبار سے اس حدیث کے انتہائی ضعیف ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ ابو ہریرہ والی سند میں جویباری ہیں جن کے جھوٹ کی مثال پیش کی جاتی ہے، لہذا یہ سند بھی غیر قابل قبول بلکہ موضوع ہے۔

مولانا رضوان شریفی صاحب کی تحریر پر ایک نظر:

(۱) مولانا رضوان صاحب نے پہلی بات یہ فرمائی ہے کہ مولانا اسید الحق قادری نے حدیث کا متن درست نہیں لکھا، حدیث کا متن ''اطلبو االعلم ولو كان بالصين'' نہیں بلکہ ''اطلبوا العلم ولو بالصين'' ہے، مولانا رضوان صاحب کی بات اپنی جگہ درست ہے، مگر یہاں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا اسید الحق تقریروں میں بیان کی جانے والی احادیث پر کلام کر رہے ہیں، احادیث مشہورہ کو نقل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ حدیث جن الفاظ میں زبانوں پر جاری اور مشہور ہوتی ہے انہیں الفاظ میں درج کی جاتی ہے، ہاں بعد میں اس کے درست الفاظ کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں ائمہ فن کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں، یہ حدیث

ہندستان میں لفظ ''کان'' کے ساتھ ہی عام طور پر جاری ومشہور ہے، لہذا اگر مولانا اسید الحق صاحب نے اس کو انہیں مشہور الفاظ کے ساتھ نقل کیا تو ایسا کرنے میں ان کے پاس ائمہ کا قدوہ موجود ہے۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ والی روایت کی تفصیل آپ نے پڑھ لی، اس سند میں عبد اللہ جویباری ہے۔ جس کو محدثین جھوٹ کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔ اس سند کے بارے میں مولانا شریفی فرماتے ہیں: ''اس سند سے بھی حدیث کو اسی وقت موضوع کہا جائے گا جب کہ قصداً اس سے افترا ثابت ہو ورنہ حدیث کو موضوع نہیں کہا جائے گا اگرچہ وہ متہم بالوضع ہے جیسا کہ اصول حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے''۔

''متہم بالوضع'' کی حدیث موضوع نہیں ہوتی اس پر اصول حدیث کی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، جب کہ یہاں کسی کتاب کا حوالہ ضروری تھا مگر ایک لائن کے بعد ابو عاتکہ پر امام ذہبی کا کلام ذکر کرنے کے بعد خود ہی فرماتے ہیں ''اور جب تک کسی راوی کے بارے میں متہم بالوضع کا ثبوت نہ ہو جائے اس وقت تک اس کو موضوع نہیں کہا جا سکتا''

پہلی بات تو یہ ہے کہ جویباری کے بارے یہ دعوی کرنا ہی درست نہیں کہ اس کا کذب ثابت نہیں کیونکہ ائمہ محدثین تو اس کو کذاب، دجال اور جھوٹوں کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔ ابن جوزی نے اس کا شمار کبار کذابین میں کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پہلے تو مولانا رضوان صاحب نے متہم بالوضع کی حدیث کے موضوع ہونے سے انکار کیا اور ایک لائن بعد اس کا موضوع ہونا تسلیم کر رہے ہیں، تو ان کا پہلا قول صحیح مانا جائے یا دوسرا؟

''متہم بالوضع'' کی حدیث جرح کے تیسرے درجہ کی حدیث شمار کی جاتی ہے۔ (الفیہ، صفحہ ۳۷۵) اور یہ درجہ گرچہ ''وضاع'' سے کم درجہ کا ہے تاہم اس سے متصف راوی کی حدیث کا بھی کچھ اعتبار نہیں کیا جاتا۔ عبد الرحمن بن مہدی نے ایسے راویوں سے حدیث کی روایت نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ (العلل ومعرفۃ الرجال، ۲۱۸/۳)

(۳) ایک جگہ شریفی صاحب نے لکھا کہ محدثین کے نزدیک ''لا یصح'' کا مطلب موضوع نہیں ہوتا اور یہی ابن جوزی کا بھی نظریہ بتایا ہے۔ محدثین کی طرف اس کی نسبت تو صحیح معلوم ہوتی ہے مگر ابن جوزی نے اپنی ''موضوعات'' میں اپنی شرط کے مطابق موضوع حدیث ہی جمع کی ہیں اگرچہ بعض دوسرے محدثین کی شرطوں کے مطابق ''موضوعات'' کی بعض حدیثیں ضعیف، حسن، یا صحیح لغیرہ کے درجہ میں ہیں، لہذا ابن جوزی جب موضوعات میں ''لا یصح'' کہتے ہیں تو اپنی شرط کے مطابق ''موضوع حدیث'' ہی مراد لیتے ہیں، جیسا کہ ''موضوعات'' کے مقدمہ صفحہ ۱۹ اور ۴۲ پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مولانا اسید الحق نے اگر بعض حدیثوں کو موضوع یا انتہائی ضعیف قرار دیا ہے تو اس کے حوالے بھی دے دیے ہیں جس سے کم از کم اتنا واضح ہے یہ حدیث ان محدثین کے نزدیک موضوع یا انتہائی ضعیف ہیں، ایسا ممکن ہے کہ امام سیوطی یا بعض دیگر علما اس کو موضوع یا انتہائی ضعیف نہیں مانتے ہوں۔

مولانا شریفی صاحب نے اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حدیث زیادہ سے زیادہ ضعیف ہے انتہائی ضعیف اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی منکر یا متروک راوی نہیں (ملخصا) جب کہ ابو عاتکہ کا منکر اور متروک دونوں ہونا ثابت ہے، لہذا حدیث کے انتہائی ضعیف ہونے میں بھی کچھ مانع نہیں۔ جہاں تک امام سیوطی کی ابو عاتکہ کو کذب اور تہمت سے بری سمجھنے کی بات ہے تو یہ ان کا اپنا خاص نظریہ ہے۔

اس حدیث کو اگرچہ بعض علما نے حسن کہا ہے تاہم یہ اصول پیش نظر ہونا چاہیے کہ حدیث اگر انتہائی ضعیف ہو تو اس کے ایک نہیں اگر ایک درجن بھی طرق ہوں تو بھی وہ حسن نہیں ہوتی، جیسا کہ امام نووی نے اربعین میں ذکر کیا ہے۔ یہاں اس حدیث کے چھ نہیں بلکہ دو ہی طرق ہیں ایک طریقہ حضرت ابو ہریرہ سے اور دوسرا حضرت انس سے مروی ہے۔ حضرت انس والی روایت میں ابو عاتکہ کے بعد اس کی شاخ مختلف ہو جاتی ہے جس سے اس کو مستقل سند سمجھنا اصول حدیث کے منافی ہے۔ ان دونوں طریقوں کے رواۃ انتہائی درجہ کے ضعیف ہیں، لہذا حدیث کو حسن نہیں کہا جا سکتا، بلکہ حضرت ابو ہریرہ والی روایت موضوع ہے اور حضرت انس والی روایت انتہائی ضعیف۔

مولانا اسید الحق نے ''اس حدیث کے بارے میں کہا تھا کہ ''یہ انتہائی ضعیف اور بعض کے نزدیک موضوع ہے'' یہ دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں، ہاں البتہ اس حدیث کے قابل تحمل ہونے یا نہ ہونے کے سلسلے میں مولانا اسید الحق صاحب سے اختلاف رائے کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس حدیث کے انتہائی ضعیف ہونے کے باوجود فضائل میں اس کا اعتبار کیا جائے گا، یہی جمہور محدثین کا نظریہ ہے۔ □□□

شیخ العلما علامہ غلام جیلانی: ایک ملاقات

شیخ العلماء حضرت علامہ الحاج غلام جیلانی علیہ الرحمہ سابق (شیخ الحدیث دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف، یوپی) سے ان کی علمی و دینی خدمات اور رائج نصاب کے سلسلے میں **مولانا محمد عاصم اعظمی** (استاذ: مدرسہ شمس العلوم، گھوسی، مئو) نے حضرت موصوف کے انتقال پر ملال سے چند ماہ قبل انٹرویو کیا تھا، جس کی اشاعت ماہ نامہ "فیض الرسول" براؤں کے شیخ العلماء نمبر (اپریل، مئی ۱۹۷۷ء) میں ہوئی تھی۔ رسالہ مذکور کے شکریے کے ساتھ یہ معلوماتی انٹرویو قارئین جام نور کی نذر ہے۔ (ادارہ)

ہمارا اگلا سوال تھا حضور آپ ادب سے خصوصی دل چسپی رکھتے ہیں، کیا آپ شاعری بھی فرماتے ہیں، آپ اردو شاعری میں کس کی شاعری سے زیادہ متاثر ہیں؟ ارشاد ہوا:

میں نے کبھی کبھار حسب موقع عربی زبان میں اشعار لکھے ہیں، ویلور (مدراس) میں حضرت عبد اللطیف صاحب ویلوری علیہ الرحمہ کی شان میں ایک قصیدہ عربی میں لکھ کر میں نے پیش کیا تھا، جسے دیکھ کر حضرت سجادہ نشیں صاحب قصیدے کی روانی و سلاست اور محاسن شعری سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور مجھے انعام میں ایک گھڑی عطا فرمائی تھی۔ پورا قصیدہ ویلور میں موجود ہے۔ وطن مالوف کے قدیم دینی ادارہ کی تعلیمی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر میں نے چند اشعار لکھے تھے، یہ اشعار دار العلوم شمس العلوم گھوسی کے سالانہ اجلاس میں حضرت محدث اعظم صاحب علیہ الرحمہ نے پڑھوائے تھے اور بے حد مسرور ہوئے تھے۔

یا مرجع الانام ویا صاحب الھمم
صلیٰ علیک رب ذو الجلال والکرم
یا من اذا دعوت الیٰ دین ربنا
دانت لک العرب و لانت لک العجم
فی لیلۃ الفراق لقد اظلم الفضا
نور بنور وجھک یا کاشف الظلم
شمس العلوم قد طلعت فی دیارنا
فارزق بھا الھدایۃ والرشد والحکم
انعم علی من اقتبسوا انور علمکا
واسلک بھم سبیلک یاھادی الامم

مارہرہ مطہرہ میں حضرت صوفی سید مہدی میاں صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کا انتقال ۱۳۶۱ھ میں ہوا۔ آپ سلسلہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ شریف کے سجادہ نشیں تھے اور حضرت شاہ ابو الحسن نوری علیہ الرحمہ کے خلیفہ و مجاز تھے، ان کے انتقال پر ملال کی تاریخ مغفور لہ، نکلی اس کو مندرجہ ذیل دو شعروں میں میں نے منظوم کیا:

ہے وصال حضرت مہدی کا چرچا سو بسو
آنکھ برساتی ہے اشکوں کی جگہ گویا لہو!
جب کہ تاریخ وصال پاک کی تھی جستجو
قال قلبی اکتب التاریخ مغفور لہٗ
۱۳۶۱ھ

سید العلما حضرت مولانا سید آل مصطفیٰ صاحب علیہ الرحمہ سابق صدر آل انڈیا سنی جمعیۃ العلما ممبئی، براؤں شریف کے سلسلہ دستار بندی میں تشریف لائے تھے تو انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ کے اشعار حضرت مہدی علیہ الرحمہ کے مزار پاک پر آویزاں ہیں اور ہماری بیاض میں محفوظ ہیں۔

براؤں شریف آنے کے بعد یہاں کی نماز پنج گانہ کی امامت میرے سپرد ہوگئی، اس وجہ سے حضرت شعیب الاولیاء علیہ الرحمہ بعض مواقع پر مجھ سے فرماتے نماز کے بعد فلاں مقصد کے لیے دعا کیجیے گا۔ اسی سلسلہ میں حضرت نے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ "مولوی بدر الدین صاحب اور مولوی نعیمی صاحب علیل ہیں اور جمن صاحبہ (حضرت کی اہلیہ ان کو تمام مدرسین اور خلیفہ صاحب اماں جی کہا کرتے تھے) بھی علیل ہیں ان سب کی صحت کے لیے بعد نماز دعا کیجیے گا۔" بحمدہ تعالیٰ وہیں بیٹھے بیٹھے دو شعر ذہن میں آگئے حضرت کو سنا کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو بعد نماز انہی اشعار کے ساتھ دعا کروں، حضرت اشعار سن

کر بہت مسرور ہوئے اور اجازت دے دی، وہ اشعار یہ ہیں:

شفاءک رب ذا الفضل العظیم
لبدر الدین والشیخ النعیم
وعاف اتنا ام الخلیفہ
عن الامراض باللطف العمیم

میں نے اردو شاعری کے ذخائر میں صرف نعتیہ شاعری کا مطالعہ کیا اور اس سلسلہ میں کلام اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ سے بے حد متاثر ہوں۔ اعلیٰ حضرت کی شاعری قلب کے حقیقی جذبات کی ترجمان ہے اور شعر کا ایک ایک لفظ عشق وعرفان میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ نعت پاک کے پڑھنے یا سننے سے قلب متاثر ہوتا ہے اور روح عشق محمدی کا سرور پاتی ہے، معنیٰ ومفہوم کے لحاظ سے اعلیٰ حضرت کے اشعار گراں قدر علمی معلومات فراہم کرتے ہیں اور جتنا زیادہ علم وفضل جس کے نصیب میں ہے وہ اتنا ہی زیادہ کلام اعلیٰ حضرت کی گہرائیوں تک پہنچ کر اشعار کے برکات ومعارف کی تہ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ مولانا حسن رضا خاں صاحب بریلوی علیہ الرحمہ کی نعتیہ شاعری سے بھی متاثر ہوں اور اسے پسند کرتا ہوں۔

حضرت شیخ العلماء نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت کے درج ذیل شعر کی تشریح نہایت بلیغ انداز میں فرمائی:

سب چمکنے والے اجلوں میں چمکا کیے
اندھے شیشوں میں چمکا ہمارا نبی

اگلے انبیاے کرام کی بعثت کا سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ پہلے نبی دنیا سے رخصت ہوتے تو بعد والے نبی تھوڑے وقفہ کے بعد تشریف لے آتے پہلے نبی کے نور ہدایت کا اجالا اور اس کی روشنی باقی رہتی اور لوگوں کے شیشہ ہائے دل قدرے صاف وشفاف رہتے کہ دوسرے نبی کی بعثت ہو جاتی اس طرح آنے والے نبی کو تبلیغ دین میں آسانی ہوتی۔ مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد چھ سو برس کے وقفہ پر تشریف لائے اس وقت گمراہی پورے طور پر مسلط ہو چکی تھی حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم الصلاۃ والسلام) کی تعلیمات کو لوگ بھول چکے تھے (الا ماشاء اللہ) شرک و بت پرستی کی تاریکی چھائی ہوئی تھی لوگوں کے قلوب کے شیشے تاریک اور اندھے ہو چکے تھے ایسے لوگوں کو راہ راست پر لانا بہت مشکل کام ہے۔

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ اس شعر میں انبیاے سابقین علیہم الصلاۃ والسلام کی ہدایت کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے ہدایۂ کاملہ کی فضیلت بیان فرما رہے ہیں کہ گزشتہ انبیائے کرام نے ایسے وقت میں تبلیغ وہدایت شروع کی کہ اکثر لوگوں کے قلوب قبول ہدایت کی صلاحیت رکھتے تھے، ان سے پہلے نبی کے انوار کی شعائیں ابھی باقی تھیں کہ ان کی بعثت ہو گئی اس لیے دین برحق کی تبلیغ ان کے لیے آسان تھی مگر ہمارے نبی ﷺ ایسے وقت میں مبعوث ہوئے کہ آپ سے پہلے نبی کے انوار ہدایت منعدم ہو چکے تھے لوگوں کے قلوب تاریک اور سخت ہو چکے تھے ایسے لوگوں کی ہدایت کرنا مشکل ترین کام تھا مگر رسول اللہ ﷺ کا یہ کمال تھا کہ ایسے لوگوں کو بھی راہ راست پر لائے اور ان کے قلوب کو نور اسلام سے منور فرمایا۔

بعض معاندین فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے اس شعر پر اعتراض کرتے ہیں:

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا

ہم نے موقع غنیمت سمجھا اور اس شعر کی تشریح وتوضیح چاہی حضرت شیخ العلماء نے ارشاد فرمایا:

اعتراض یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور حضور اکرم ﷺ دونوں مالک ہوئے تو ایک مملوک میں دو مالکوں کا اشتراک ہوا یہ شرک ہے۔

جواب سے پہلے چند ضروری مقدمات سن لیجیے (۱) ایک ملکیت حقیقۃً وبالذات ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ہر ممکن کا خالق ہے وہی مالک کل ہے للہ ما فی السموات ومافی الارض ایسی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

(۲) دوسری ملکیت مجازی ہوتی ہے مثلاً وہ ملکیت جو بیع وشرا ہبہ یا میراث کے ذریعہ ہو۔ یہاں مالک اور مملوک دونوں حقیقۃً اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں یہ ملکیت صرف ممکن ہی کے لیے ہوتی ہے ایسی ملکیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہرگز نہیں ہو سکتی ہے۔

(۳) اسی طرح ایک ملکیت مجازی بر بنائے محبت بھی ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ اللہ کے دربار میں محبوب ترین ہستی ہیں۔

(الف) قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

(ب) انا اعطینک الکوثر (بعض مفسرین نے یہاں کوثر بروزن فوعل، بمعنی خیر کثیر مراد لیا ہے جس میں ہر نعمت حاصل ہے

شیخ العلما علامہ غلام جیلانی

(ج) لولاک لما خلقت ارضا و لاسماءً

ان کے علاوہ اور بھی نصوص ہیں جو آپ کے افضل ترین محبوب ہونے پر دال ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ جب کسی کو کسی کے ساتھ محبت خالص ہوتی ہے تو محب اپنے مملوک اشیا میں محبوب کے ساتھ تفریق کا برتاؤ نہیں کرتا۔ محبوب یہ نہیں کہتا کہ فلاں فلاں چیزیں میری ہیں اور فلاں فلاں اشیا تمہاری، یہاں میرا و تیرا کا معاملہ نہیں ہوتا، محب صادق اپنے مملوک پر محبوب کے تصرف کو پسند کرتا ہے یہ بھی مجازی ملکیت کی ایک قسم ہے۔

(۳) اب مذکورہ بالا شعر کے مطلب کی طرف توجہ کیجیے

(الف) میں تو مالک ہی کہوں گا رسول اللہ ﷺ مالک ہیں لہذا میں حضور کو مالک ہی کہوں گا۔ یہ دعویٰ ہے

(ب) ''کہ ہو مالک کے حبیب،، اس میں لفظ 'کہ' تعلیل کے لیے ہے، مذکورہ دعوی کی علت کو بتاتا ہے، ''ہو مالک کے حبیب'' یہ مذکورہ بالا دعویٰ کی دلیل مجمل ہے۔

(ج) ''یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا'' یہاں 'یعنی' کا کلمہ بمنزلہ حرف تفسیر ہے ''محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا'' یہ مذکورہ بالا دلیل مجمل کی توضیح ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ مالک ہیں لہذا میں آپ کو مالک کہوں گا۔ آپ کے مالک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو مالک حقیقی ہے وہ آپ کا محب صادق ہے آپ اس کے محبوب کامل ہیں محب صادق کی مملوک اشیا گویا محبوب کی مملوک ہیں، کیوں کہ محب اور محبوب کے درمیان میرا مملوک اور تیرا مملوک کا برتاؤ نہیں ہوتا، اس شعر میں اللہ تعالیٰ کی مالکیت حقیقیہ کو تسلیم کیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی مالکیت مجازیہ کو ثابت کیا گیا ہے یہ شرک نہیں۔

پھر یہ بھی سوچیے کہ اس شعر پر اعتراض کرنے والوں نے بھی کبھی کہا ہوگا کہ فلاں مکان فلاں کتاب یا فلاں قلم کا مالک میں ہوں اس کے ساتھ وہ بھی تسلیم کرتے ہوں کہ ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے للہ مافی السموات وما فی الارض (ملکا خلقا وعبیدا) پھر جب ان معترض صاحب نے اللہ تعالیٰ کی مملوک شے پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا تو یہ شرک کیوں نہیں ہوا؟ وہ یہی جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت حقیقۃ وبالذات ہے، اور ان کی ملکیت مجازی ہے، تو اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے کلام میں حقیقت و مجاز کی تاویل کیوں نہیں کرتے؟ حالاں کہ اعلیٰ حضرت کے کلام میں ملکیت مجازی کی توضیح بھی ہے۔

مولانا محمد عاصم اعظمی

حضرت شیخ العلما نے حج بیت اللہ اور زیارت حرمین شریفین کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ ہم نے حرمین شریفین کے ان واقعات اور حالات کے بارے میں پوچھا جو آپ پر اثر انداز ہوئے حضرت نے ارشاد فرمایا:

سفر حج میں مجھ پر دو قسم کے اثرات مرتب ہوئے خوش کن اثرات، اور اذیت رساں اثرات، خوش کن اثرات کے اسباب کی مختصرا چند مثالیں یہ ہیں (الف) جدہ میں حاجیوں کے لیے آرام دہ مسافر خانہ بنا ہوا ہے، اس سبب سے حاجیوں کو اقامت کرنے میں کافی سہولت ملتی ہے، (ب) جدہ سے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ تک وسیع سڑک بن گئی ہے اس وجہ سے حجاج بذریعہ بس بہ آسانی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں (ج) صفا اور مروہ کے مابین مسافت مسقف ہوگئی ہے خواہ شدید دھوپ رہے، بارش ہوتی ہو حاجیوں کے لیے اس میں طواف کی زحمت نہیں پیش آتی (د) جنت المعلیٰ اور جنت البقیع کے مزارات مقدسہ کی حاضری اور صاحب مزار کی طرف رخ کر کے ہاتھ اٹھا کر ایصال ثواب کرنے پر حکومت سعودیہ کی طرف سے اب کوئی ممانعت نہیں ہے، شاہ فیصل سے پہلے صاحب مزار کی طرف رخ کر کے کچھ پڑھنا اور ادھر رخ کر کے ہاتھ اٹھا کر ایصال ثواب کرنا جرم قرار دیا گیا تھا، جیسا کہ مولوی احمد یار خان صاحب پاکستان نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے۔ (ر) حرمین طیبین میں خاص کر مسجد حرام میں اور مسجد نبوی ﷺ میں صفائی کا انتظام بہت بہتر ہے۔ اب اذیت رساں اثرات کے اسباب مختصراً سن لیجیے:

(الف) جدہ کے مسافر خانہ میں حجاج کے لیے بیت الخلا بنا ہوا اور مکہ معظمہ میں مسجد الحرام کے قریب ایک بیت الخلا عام لوگوں کے لیے ہے، بعض لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ ابوجہل کا مکان تھا، ان دونوں بیت الخلا میں قد مچے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ان پر بیٹھنے والے کا رخ یا تو خانہ کعبہ کی طرف ہوگا یا اس کی پشت ہوگی یہ امر نہایت تکلیف دہ ثابت ہوا۔

(ب) مسجد الحرام میں مطاف کعبہ کے کنارے متعدد عرب فوٹو گرافر کیمرہ لیے کھڑے ہیں اور حاجیوں سے فوٹو کھینچوانے کی فرمائش کرتے ہیں، بعد رضامندی ان کا فوٹو کھینچ کر ان کے حوالے کرتے ہیں اور اجرت میں ان سے طے شدہ ریال وصول کرتے ہیں۔ اس طرح یہ

لوگ سیکڑوں ریال روزانہ کماتے ہیں-حکومت سعودیہ کی طرف سے ان لوگوں کو وہاں تصویر کشی کی عام اجازت ہے، بعض نادان حاجی گمراہ ہوجاتے ہیں ان میں سے ایک حاجی صاحب سے میں نے نہایت نرمی سے کہا کہ آپ نے اپنا فوٹو کھنچوا کر معصیت کا ارتکاب کیوں کیا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہی سمجھتے تھے کہ جاندار کی تصویر کھینچنا اور کھنچوانا حرام ہے مگر یہاں آنے کے بعد خیال بدل گیا، اس لیے حکومت سعودیہ کا شمار اسلامی حکومت میں ہوتا ہے، اگر یہ فعل ناجائز ہوتا تو یہ سرزمین حرم پر وہ بھی مسجد الحرام میں ہرگز نہ ہونے پاتے، ضرور یہاں کے علمائے اسلام کا فتوی اس کے جواز پر ہوگا اسی وجہ سے حکومت سعودیہ نے اس کی اجازت دی ہوگی"۔

یہ منظر دیکھ کر اور ناواقف حاجی کی یہ بات سن کر مجھے بہت افسوس ہوا-

حضرت شیخ العلما نے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا:

مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ مصر و پاکستان و بنگلہ دیش کے متعدد علما سے ملنے کا اتفاق ہوا-ایک ڈائری پر ان حضرات کے اسما اور خلاصہ گفتگو بھی میں نے نوٹ کرلی تھی، مگر افسوس کہ وہ ڈائری ضائع ہوگئی ان کے اسما بھی یاد نہیں رہے-صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے صاحبزادے مخدومی حضرت عبدالمصطفیٰ ازہری بھی حج کے لیے آئے تھے ان سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا، آپ لوگوں کی جدائی ان کو تڑپاتی ہے- اہل وطن احباب کے لیے دعائے خیر کرتے تھے-

جب حرمین شریفین میں علما و مشائخ سے ملاقات کی بات آئی تو مناسب معلوم ہوا کہ خلیفہ اعلیٰ حضرت حضرت علامہ شاہ ضیاء الدین قبلہ قادری مدنی سے ملاقات اور ان کی گراں مایہ شخصیت کے بارے میں بھی سوال پوچھ لیا جائے-چنانچہ ہم نے حضرت کی ملاقات اور ان کی بلند پایہ شخصیت سے جو اثرات شیخ العلما کے قلب پر پڑے ان سے متعلق سوال پیش خدمت کیا حضرت شیخ العلما نے ارشاد فرمایا:

حضرت مولانا ضیاء الدین صاحب قبلہ مدنی قادری مدظلہ کی ملاقات سے میں بے حد متاثر ہوا-جب میں حاضر بارگاہ ہوا تو اس وقت آپ ضعف و نقاہت کے باعث لیٹے ہوئے تھے-میرا نام معلوم کیا تو انہوں نے مولانا سید غلام جیلانی صاحب میرٹھی کو سمجھا، اٹھ کر بیٹھ گئے، سلام و مصافحہ کے بعد جب انہیں معلوم ہوا کہ میں براؤں شریف سے حاضر ہوا ہوں تو دوبارہ مصافحہ کیا-سب سے پہلے حضرت مفتی اعظم صاحب قبلہ دامت برکاتہم العالیہ، حضرت صوفی ساجد علی خان صاحب ،مولانا ریحان میاں صاحب، مولانا اختر رضا خاں صاحب اور استاذی حضرت مولانا حسنین رضا خان صاحب کی خیر و عافیت دریافت کی، پھر دارالعلوم منظر اسلام اور دارالعلوم مظہر اسلام کے حالات معلوم کیے، دوران گفتگو انہیں معلوم ہوا کہ میں نے دارالعلوم منظر اسلام بریلی سے فراغت حاصل کی ہے اور دارالعلوم مظہر اسلام میں تدریسی خدمات بھی انجام دے چکا ہوں تو حضرت نے کمال محبت سے سہ بارہ مصافحہ کیا- اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ سے ہر نسبت رکھنے والے کے ساتھ ان کو کامل حسن عقیدت ہے-اس سے میں کافی متاثر ہوں-شعیب الاولیا حضرت شاہ صوفی محمد یار علی صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کے محاسن بیان فرمانے لگے اور مولوی بدرالدین سلمہ کی خیریت دریافت فرمائی، دارالعلوم فیض الرسول کے حالات دریافت کیے، میں نے ان کی خیریت اور دارالعلوم کے حالات بتانے کے بعد دریافت کیا کہ مولوی بدرالدین سلمہ اور دارالعلوم فیض الرسول کا علم آپ کو کیسے ہوا؟ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ آپ کے دارالعلوم فیض الرسول کی روئیداد مولوی بدرالدین صاحب نے بعض حجاج کی معرفت میرے پاس بھیجی، میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا ہے، اس میں وہاں کے مدرسین کی فہرست درج ہے، آپ کے وہاں سے ماہنامہ فیض الرسول کے کئی پرچے بذریعہ ڈاک مجھے ملے ہیں اور آپ کے مضامین بھی اس میں شائع ہوئے، میں نے ان کا مطالعہ کیا، مولوی بدرالدین صاحب کی تصنیف کردہ کتاب سوانح اعلیٰ حضرت بھی میرے پاس پہنچ چکی ہے، ان ذرائع سے میں نے آپ لوگوں کو جانا-

حضرت مولانا ضیاء الدین صاحب نہایت متصلب سنی ہیں وہاں حاضر ہونے کے بعد ان کے تصلب فی الدین کا مشاہدہ ہوا دنیا کی کوئی مصلحت اس مرد باخدا کی شمشیر سنیت کو کند نہیں کرسکی ان کے دولت کدہ پر محفل میلاد کا انعقاد ہوتا رہتا ہے جس میں صلوۃ و سلام بھی پڑھا جاتا ہے مدینہ طیبہ میں ہزار سنی صحیح العقیدہ لوگوں کے آپ مطمح نظر ہیں وہاں کے خاص و عام سنی حضرات ان کی طرف استفتوں میں رجوع کرتے ہیں، ان مذکورہ بالا حالات نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا-

ہم نے سوال کیا سب سے پہلے حضور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ سے کب متعارف ہوئے اور ان سے شرف نیاز کب حاصل ہوا؟ آپ اعلیٰ

حضرت کی تصانیف کے مطالعہ سے کس حد تک متاثر ہوئے؟

جواباً ارشاد ہوا: میں اپنے زمانہ طالب علمی کے ابتدائی ایام میں اساتذہ سے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا اسم گرامی سنا کرتا تھا اور جب پہلی بار حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے ساتھ طلب علم کے لیے بریلی شریف ۱۳۳۹ھ میں گیا تو اعلیٰ حضرت کا دیدار میں نے اپنی ظاہری آنکھوں سے کیا، حضور رمضان شریف میں نینی تال تشریف لے گئے تھے وہاں سے واپسی کے بعد کمزوری اور جسمانی اضمحلال بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا، آپ ظہر کے وقت لوگوں کی مدد سے مسجد تشریف لایا کرتے تھے اور مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد مکان تشریف لے جاتے تھے۔ اس دوران بہت سے ارباب علم اور حاجت مند حضرات ان کے گرد بیٹھ کر مسائل دریافت کیا کرتے تھے اور میں بھی وہیں بیٹھ کر گفتگو سنا کرتا تھا، صغر سنی اور ابتدائی درجہ کا طالب علم ہونے کی وجہ سے مجھے کبھی بھی سوال پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی، ۱۳۴۰ھ ماہ صفر میں اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا، میں اس وقت بریلی شریف ہی میں زیر تعلیم تھا۔

اعلیٰ حضرت کی مصنفات علم و فضل کا بحر بیکراں ہیں، جس فن پر اور علم کے جس موضوع پر قلم اٹھایا معلومات اور تحقیق کے دریا بہا دیے ہیں، میں نے خصوصیت کے ساتھ علوم دینیہ اور عقائد کے سلسلہ میں تحقیق علم اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی تصانیف سے ہی حاصل کیا ہے، فتاویٰ رضویہ سے میں کافی متاثر ہوں۔

ہم نے اگلا سوال مشرقی یوپی کی عظیم روحانی شخصیت شعیب الاولیاء حضرت صوفی شاہ محمد یار علی صاحب علیہ الرحمہ کے بارے میں کیا کہ براؤں شریف میں رہ کر حضرت شعیب الاولیاء کی سیرت و شخصیت کا مطالعہ کرنے کا حضرت شیخ العلما کو کافی موقع ملا تھا۔

حضرت نے ارشاد فرمایا: میں ان سے کافی متاثر ہوں۔ آپ کو شریعت و طریقت کا پابند پایا آپ کا قول آپ کے عمل کے موافق تھا، ان کے تصوف میں کوئی ایسی منزل نہیں جو شریعت ظاہرہ سے متصادم ہو، آپ دینی امور کی تعلیم و تعلم کو مقدم سمجھتے تھے۔ اسی خیال کے پیش نظر آپ نے دار العلوم فیض الرسول قائم کیا، آپ وسیع النظر، فراخ دل، غیر متعصب انسان تھے، ان کی یہ کوشش نہیں رہی کہ اس دار العلوم میں وہی علما مدرس ہوں جو یار علوی ہوں، اس ادارہ میں رضوی، اشرفی، نعیمی، امجدی، مختلف روحانی خانوادے کے مدرسین ہیں اور سب کے ساتھ آپ کا حسن سلوک برابر رہا، علمائے دین کا احترام بیش از بیش کرتے تھے۔ ان کا تقویٰ، ان کی روحانیت، ان کی کرامت کی ایسی شہرت ہوئی کہ مسلم غیر مسلم امیر و غریب بکثرت اپنی اپنی حاجت برآری کے مقصد سے یہاں حاضری دینے لگے۔

آپ کے ساتھ اہل ہنود کے حسن عقیدت کا یہ عالم رہا کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ مدرسہ، مسجد اور خانقاہ کی تعمیر کے لیے آپ کو زمین کی ضرورت ہے اور اگر زمین نہ مل سکی تو براؤں شریف سے منتقل ہو کر کہیں دوسری جگہ آباد ہو جائیں گے جہاں یہ تینوں عمارتیں تعمیر کرا سکیں تو بابو مہنت سنگھ (ساکن جملا جوت) اور بابو بچو سنگھ (ساکن گوہر قتی) نے اپنی مشترکہ زمین کا ایک بہت بڑا پلاٹ براؤں شریف کی آبادی سے متصل آپ کی خدمت میں مفت بطور نذرانہ کے پیش کر دیا (کیوں کہ یہ دونوں صاحبان اپنی اپنی مشکلات میں آپ کی طرف رجوع کر کے فائز المرام ہو چکے تھے اس لیے ان لوگوں کو آپ کی جدائی گوارہ نہیں ہو سکی چنانچہ آپ اس قطعہ زمین پر دار العلوم فیض الرسول اور مسجد اور خانقاہ کی تعمیر کرائی۔ براؤں شریف کی حاضری سے پیشتر جب میں متقدمین اولیائے کرام میں سے کسی ولی کی سوانح عمری کا مطالعہ کرتا اور ان کی کسی کرامت کو پڑھتا تو دل میں تمنا پیدا ہوتی کہ کاش میں اس زمانہ میں کسی ایسے ہی صاحب کرامت بزرگ سے شرف حاصل کرتا، الحمد لوجہ الکریم کہ براؤں شریف آنے کے بعد اور آپ کی کرامت دیکھنے اور سننے کے بعد یہ تمنا پوری ہو گئی۔

بعض بعض سن ایاس میں پہنچے ہوئے اولاد سے محروم مرد و زن آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی دعا کی برکت سے صاحب اولاد ہو گئے، شہرت گڑھ کے راجہ صاحب نے آپ کی طرف رجوع کیا تو آپ نے اولاد نرینہ کی اسے بشارت دی (حالانکہ یہ پیشین گوئی لکھنؤ میڈیکل کالج کے ڈاکٹروں کے فیصلے کے خلاف تھی نیز آپ کی یہ پیشین گوئی سادھوں اور جوگیوں کی پیشین گوئی کے خلاف بھی تھی) الحمد للہ کہ آپ کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور راجہ صاحب نے آپ کو دوبارہ بلایا اور ایک فارم بطور نذرانہ کے آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہا مگر آپ نے قبول نہیں کیا۔

بانسی کے راجہ صاحب بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فائز المرام ہوئے آپ کے کشف و کرامات کے واقعات ایک نہیں بلکہ

صد ہا ہیں، اس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا، میں اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہم نے سوال کیا آپ کے برادر عزیز مولانا یزدانی صاحب مرحوم کی علمی استعداد کیسی تھی؟ ان کے کارنامے کیا ہیں؟

شیخ العلما نے ارشاد فرمایا: آپ کے سوال کا جواب مفصل چاہتا ہوں، میں عرصے سے اس فکر میں ہوں کہ آپ کے حالات زندگی قلم بند کروں، مگر کثرت کار نے اب تک مہلت نہیں دی، اس وقت مختصراً چند باتیں عرض کرتا ہوں:

(الف) آپ معیاری عالم اور قابل مدرس تھے، حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ مولوی غلام یزدانی علیہ الرحمہ کا شمار اجمیر شریف کے ممتاز طلبہ میں تھا۔

(ب) حضرت مفتی اعظم صاحب قبلہ نے ان کے انتقال کے بعد فرمایا: مولوی غلام یزدانی علیہ الرحمہ انتقال کر گئے اب ہم کو ایسا قابل مدرس ملنا مشکل ہے میں نے ان کے لکھے ہوئے فتویٰ دیکھے تو معلوم ہوا کہ انہیں فتویٰ نویسی میں کمال حاصل تھا، سبحان اللہ کیا شان افتا تھی۔

(ج) ہندوستان اور پاکستان کا جب بٹوارہ ہوا اور مولانا سردار احمد صاحب قبلہ علیہ الرحمہ پاکستان میں رہنے پر مجبور ہو گئے تو مفتی اعظم صاحب قبلہ نے فرمایا کہ: اپنی جگہ کسی کو منتخب کر کے جائیے اس پر مولانا سردار احمد صاحب نے فرمایا: مولوی غلام یزدانی میری جگہ کامیابی کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دے سکتے ہیں، بلا تامل ان کو بلا لیجیے۔

نوٹ: اس زمانہ میں مدرسہ مظہر اسلام میں ایسے قابل قابل طلبہ موجود تھے جن کو پڑھانا آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ برادر عزیز مولوی غلام یزدانی علیہ الرحمہ دار العلوم مظہر اسلام پہنچے اور طلبہ نے ان کو سراہنا شروع کیا تو مفتی اعظم نے مولانا سردار احمد صاحب کو بذریعہ خط اطلاع بھیجی کہ مولوی غلام یزدانی صاحب نے دار العلوم مظہر اسلام میں کام شروع کر دیا، آپ کا انتخاب درست ثابت ہوا، طلبہ ان کے حسن تدریس سے مطمئن ہیں، اس دار العلوم کو نعم البدل مل گیا۔

(د) دار العلوم شمس العلوم گھوسی ضلع اعظم گڑھ کی تعمیر و ترقی میں انہوں نے بڑی سعی کی یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ اس دار العلوم کے بانی ہیں، ان کی یہ خدمت نفسانی اغراض سے پاک و صاف تھی، انہوں نے یہ ادارہ قائم کر کے قوم کے ہاتھ میں دے دیا اس پر اپنا تسلط باقی نہیں رکھا۔

عزیز موصوف اور ان کی حسن کارکردگی کا تذکرہ میں اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں، پھر اگر موقع ملا تو مزید معلومات فراہم کروں گا۔

حضرت شیخ العلما کی زندگی عرصہ دراز سے خلوت خانہ اور گوشہ عبادت میں گزر رہی ہے، تدریسی اوقات کے علاوہ تمام تر وقت اوراد و وظائف اور تسبیح و تہلیل میں گزرتا ہے، میلان طبع تصوف کی طرف بیش از بیش ہے، ہم نے حضرت کی زندگی کے اس پہلو سے متعلق بھی بیک وقت کئی سوال کر ڈالے کہ آپ کا میلان طبع تصوف کی طرف کب ہوا؟ آپ کو کس مرشد کامل سے بیعت و خلافت حاصل ہوئی؟ آپ کے خلفا کون ہیں؟ حضرت نے ان سوالوں کے جوابات مختصراً بیان فرمائے:

بریلی شریف کے دوران قیام میں ۱۳۷۹ھ میں مجھ پر کیف کا عالم طاری ہوا اور میں مسلسل چھ سال باوضو رہا اور فرائض کے ساتھ تہجد کا بھی پابند رہا، مجھے حضرت سید شاہ محمد اسماعیل حسن مارہروی علیہ الرحمہ سے شرف بیعت حاصل ہے، مجھے حضرت تاج العلما صاحب آستانہ قادریہ برکاتیہ سے اور صدر الشریعہ بدر الطریقہ علیہ الرحمہ اور تاجدار اہل سنت حضرت مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدسیہ اور عزیز الاولیا صاحب رام پوری سے اجازت و خلافت حاصل ہوئی، حضرت سجادہ نشین صاحب قبلہ (کچھوچھہ مقدسہ) سے بھی فیوض و برکات حاصل ہیں۔ میرے خلیفہ اول مولانا نعیم الدین صدیقی (شیخ الحدیث مدرسہ تنویر الاسلام امرڈوبھا ضلع بستی) ہیں اور خلیفۂ ثانی مولوی سید نظام الدین صاحب (سیتاپوری) مدرس مدرسہ ارشاد العلوم موضع شمسا ضلع بہرائچ ہیں۔□□□

ڈاکٹر خواجہ اکرام کو اردو نیٹ جاپان کی جانب سے ایوارڈ

جاپان کا آن لائن اردو اخبار جو تقریباً پچاس ملکوں میں پڑھا جاتا ہے اور جاپان میں مقیم ہندستانیوں، پاکستانیوں اور اردو بولنے والی کمیونٹی کے لیے ادبی، تہذیبی اور ثقافتی پروگرام منعقد کراتا رہتا ہے اور ہر سال اردو نیٹ جاپان کی سالگرہ پر شاندار تقریب کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ اس موقعے سے سال کے بہترین کالم نگار کو جیوری کے فیصلے پر ایوارڈ سے بھی نوازا جاتا ہے۔ ۲۰۱۰ کے لیے ڈاکٹر خواجہ اکرام کو اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے جو ۲۸ مئی کو جاپان کے شہر ٹوکیو میں منعقد ہونے والی تقریب میں دیا جائے گا۔ جام نور کی پوری ٹیم اس ایوارڈ کے لیے ڈاکٹر خواجہ اکرام کو مبارک باد پیش کرتی ہے۔

مبصر: نورین علی حق☆

نام مجلہ: الاحسان (کتابی سلسلہ-۲)

مدیر: حسن سعید صفوی **مرتبین:** مجیب الرحمٰن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمٰن علیمی، رفعت رضا نوری

صفحات: ۴۰۸ **قیمت:** ۱۰۰ روپے، **سال اشاعت:** مارچ ۲۰۱۱ء **ناشر:** شاہ صفی اکیڈمی/ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الٰہ آباد (یوپی)

صارفیت کے اس دور میں جب کہ اخلاقیات، روحانیت، اخلاص وللّٰہیت کی حقیقت نہ صرف یہ کہ خارجی سطح پر خون آلود ہے بلکہ داخلی سطح پر بھی یہ اصطلاحات برائے نمائش ہی رہ گئی ہیں اور ہندوستان میں کروڑوں مسلمانوں کی موجودگی اور لاکھوں مدارس وجامعات کی سرگرم علمی وتحقیقی خدمات کے باوجود اسلام کا چراغ ٹمٹما رہا ہے، بولہبی شرارے چراغ مصطفوی کو ہر آن بجھا دینا چاہتے ہیں- ایسے اعصاب شکن دور میں بھی ہندوستان میں چند ایک خانقاہیں موجود ہیں جو اپنے اسلاف کے نقوش قدم سے چمٹ کر خالص دینی جذبے کے پیش نظر کام کر رہی ہیں اور تائید غیبی بھی ان کے ساتھ ہے- یہ کاروان شوق تمام تر باد مخالف کے باوجود اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہے- انہی خانقاہوں میں ایک نام خانقاہ عارفیہ، سید سراواں الٰہ آباد کا ہے، جس کے زیر اہتمام چلنے والے جامعہ عارفیہ سے جہاں صالح اور نیک خو علما نکل رہے ہیں، شاہ صفی اکیڈمی کے ذریعے اذہان وقلوب کو منور ومجلی کر دینے والی تصانیف منصۂ شہود پر آ رہی ہیں تو وہیں خانقاہوں کے قیام کا جو بنیادی مقصد تھا وہ اس کی بازیافت کی کوششیں بھی کر رہی ہے- جس کے مضبوط شواہد موجود ہیں اور ان تمام فتوحات کا سہرا خانقاہ عارفیہ کے موجودہ زیب سجادہ حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی کے سر جاتا ہے جو پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کتنے ہی گفتار کے غازی، کردار سے عاری، انانیت میں چور نئی نسل کے نوجوان علما کو صراط مستقیم کی راہ دکھا کر "ان تعبد اللہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ فانہ یراک" کی راہ کا متلاشی بنا دیا- غالباً خانقاہ کے قیام کا مقصد یہی ہے-

سال گزشتہ سے خانقاہ عارفیہ "الاحسان" نامی تصوف پر علمی، تحقیقی اور دعوتی کتابی مجلہ بھی نکال رہی ہے، جس کا دوسرا شمارہ پیش نظر ہے، جس میں تصوف کا ذوق رکھنے والے قارئین کی تسکین کے لیے تصوف سے متعلق ہر طرح کا مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے، عشق حقیقی سے لبریز شاعری، قدما کی کتابوں سے اہم مضامین، شیخ صفوی کے مواعظ، ایک نومسلم کی طلب راہ ہدایت کی داستان، تصوف کی ارتقائی تاریخ، شیخ ابن تیمیہ کا تصوف سے انسلاک، تصوف کے جدید مفکرین کی اہم کتابوں کا حاصل مطالعہ، خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کی تاریخ، خدمات اور کارنامے پر مفصل مضمون، صوفی ادب، حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر کی شخصیت اور فن پر ایک وقیع اور خصوصی گوشہ، تصوف کی تازہ ترین شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرہ گویا یہاں گلہائے رنگارنگ موجود ہیں۔ جس کا جی چاہے جس پھول سے لطف اندوز ہو اور حقیقی لذت ولطافت سے شاد کام ہوتا رہے- البتہ یہ اپنوں کے وجود سے فاسد مادہ زائل کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتا اور حق بات کہو جرأت اظہار نہ بیچو، کو اپنا مطمح نظر بناتے ہوئے "واردات" سے ہی آپریشن شروع کر دیتا ہے-

"تصوف آدمی کو صرف اپنی زندگی جینے تک محدود نہیں کرتا بلکہ وہ جینے دو، کا اصول بھی بتاتا ہے- وہ صرف عزت وتوقیر کا خواہش مند نہیں ہوتا- وہ فرد اور سماج کو توقیر بخشتا ہے- حقیقت تصوف کو رنگ برنگے کپڑوں، تسبیح کے موٹے دانوں اور تعویذ اور گنڈوں سے کوئی واسطہ نہیں- تصوف روحانی سفر کا نام ضرور ہے لیکن وہ اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ یہ سفر صرف جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصولوں پر طے ہو سکتا ہے- جب یہ حقیقت سامنے آئے گی تو پھر روحانیت کے نام پر وحدت ادیان کے جو تصورات ہیں وہ از خود مٹ جائیں گے، جب یہ حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی تو عصر حاضر کا پریشان حال نوجوان از خود اس چشمہ صافی سے قریب ہو کر اپنی پیاس بجھانے لگے گا-" (ص:۲۴)

ہندوستان کے مختلف گوشوں میں شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی کے کتنے ہی نادیدہ عشاق ہیں جن کے دلوں میں ان سے شرف نیاز کا شوق موجود ہے- ان کی دلی تسکین کے لیے شیخ کے افادات سے جسے مجیب الرحمٰن علیمی نے مرتب کیا ہے، میں ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں-

"اسلام وایمان کی خوب صورتی اور اس کا حسن احسان ہے- حسن اور احسان کا مادہ بھی ایک ہے- اسلامیات یعنی ظاہری اعمال

☆alihaqnm@yahoo.com

وافعال دوسرے الفاظ میں شرعی قوانین سے تعلق رکھنے والے اوران کی حفاظت میں سرگرداں رہنے والوں کو فقہاے اسلام کہتے ہیں اور قلبی افعال یعنی ایمانیات سے متعلق مسائل سے بحث کرنے والوں کو متکلمین وائمہ عقائد کہتے ہیں اوران دونوں کی حفاظت وپیروی کرتے ہوئے بغض وحسد، کینہ وعداوت، غیبت وچغل خوری سے بچتے ہوئے حسن خلق کا مظاہرہ کرکے اسلام وایمان میں حسن پیدا کرنے والوں کو صوفیہ کہتے ہیں''- (ص 42)

ایک صوفی کی زبانی صوفی ہونے کے لیے جو شرائط بیان کی گئی ہیں وہ صوفیت کے دعویدار حضرات کو دعوت احتساب دیتی ہیں-

اس مرتبہ مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی نے ناقدین تصوف کے امام شیخ ابن تیمیہ کا انتخاب کیا ہے اور کافی محنت سے مضمون لکھا ہے- اپنے مفصل اور مبسوط مقالے میں انہوں نے منظر نامہ صاف کردیا ہے، جس سے آگے کی راہ آسان ہوگئی ہے- ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موضوع پر مزید کام ہو البتہ بعض دفعہ میں یہ سوچتا ہوں کہ ضیاء علیمی کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ انہوں نے گزشتہ شمارہ میں شیخ ابن قیم کو اور اس مرتبہ شیخ ابن تیمیہ کو خانقاہ میں لا کھڑا کیا اور اگر آگے بھی انہوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو نہ جانے کتنے مخالفین تصوف موافقین تصوف کی صف میں کھڑے نظر آئیں گے، پھر ہمارے اسٹیجی علما اور سلفی مخالفین تصوف کے پاس کون سا ایجنڈہ رہ جائے گا؟ لہٰذا میں دونوں گروہ کے بھرم کی بقا کے لیے ان سے سفارش کروں گا کہ براے مہربانی وہ کسی کا حقہ پانی بند نہ کرائیں-

بہر حال ضیاء علیمی نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ لائق ملاحظہ ہے-

''وہ (ابن تیمیہ) تصوف شرعی اور غیر شرعی کے مابین فرق کرتے ہیں، مشائخ کتاب وسنت کی مدح کرتے ہیں، فنا وبقا، جمع اور فرق اور اس طرح کی دوسری اصطلاحات تصوف کو معانی ومدلولات میں قدرے اختلاف رکھتے ہوئے قبول کرتے ہیں، گروہ صوفیہ کو مختلف درجوں میں تقسیم کرتے ہیں، پہلے گروہ کو سابقین مقربین اور صدیقین میں شمار کرتے ہیں، کرامات وکشوف، الہامات اور تفسیر اشاری کے قائل ہیں، مطابق الہامات کے ذریعہ شرعی مسئلہ میں ترجیح کو شرعی ترجیح قرار دیتے ہیں- توسل میں بھی تفصیل کے قائل ہیں، خواب میں وہ رویت باری کے منکر نہیں بلکہ بیداری کی حالت میں رویت قلبی کے امکان کو درست ٹھہراتے ہیں، اس کے علاوہ خود ان کی زندگی بھی حقیقت تصوف کے رنگ میں رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے''- (ص: ۱۴۴/۱۴۵)

اس مرتبہ ایک نئے گوشے ''حاصل مطالعہ'' کا اضافہ کیا گیا ہے اور تصوف کے سلسلے میں مشرق ومغرب کے چھ اہم متصوفین کے نظریات وخیالات پیش کیے گئے ہیں- شیخ محمد الغزالی اور تصوف/ ذیشان احمد مصباحی، فتح اللہ گولین اور تصوف/ ڈوگن کاک/ اشرف الکوثر مصباحی، امام عبد الحلیم محمود اور تصوف/ مولانا منظر الاسلام ازہری، سید یوسف ہاشم رفاعی اور تصوف/ رفعت رضا نوری، علامہ محمد احمد مصباحی اور تصوف/ طیب فرقانی، پروفیسر طاہر القادری اور تصوف/ نورین علی حق بالترتیب یہ مضامین شامل رسالہ ہیں- ان میں پہلے شخصیت کا اختصار وایجاز کے ساتھ تعارف پیش کیا گیا ہے اور بعد میں اس کے نظریات کی نشان دہی کی گئی ہے-

''صوفی ادب'' کے گوشے پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے جس کی وجہ سے گوشہ قابل مطالعہ اور دلچسپ ہے- گوشہ میں تین مضامین شامل ہیں اور تینوں اپنی نوعیت کے انوکھے اور نرالے ہیں- پروفیسر عبد المنان طرزی کو شاعری پر ید طولیٰ حاصل ہے، ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب انہوں نے بہار کے ادبا کی منظوم تاریخ لکھی- اس مجلہ میں موصوف نے حضرت مولانا جلال الدین رومی کی حیات وخدمات کو نظم کیا ہے، پروفیسر عقیل ہاشمی نے ولی اورنگ آبادی کے تصوف پر گفتگو کی ہے اور تصوف سے مملو ولی کے اشعار بھی نقل کیے ہیں اس گوشہ کا پہلا مضمون ''امیر خسرو- روحانیت اور تصوف کے علم بردار'' ہے، اس میں پروفیسر مسعود انور علوی نے حضرت امیر خسرو کی شخصیت، ان کے فن، روحانیت وتصوف، ان کی حب الوطنی کے جذبات قلم بند کیے ہیں- یہ مضمون اس گوشے کی جان ہے اور طوطی ہند کے فن سے واقفیت کے لیے کافی ہے-

مجموعی اعتبار سے مجلّہ لائق دید وداد ہے- ہر علمی میز تک پہنچ کر اپنے مطالعہ پر مجبور کرنے والا ہے- فی زمانہ تصوف کے حوالے سے ''الاحسان'' کے علاوہ اتنا ضخیم، معیاری، علمی، تحقیقی اور ظاہری وباطنی رعنائی وزیبائی میں اس کا ہمسر کوئی دوسرا مجلّہ کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا- ''حاصل مطالعہ'' کے گوشے میں شامل آخری مضمون کے علاوہ تمام مضامین اپنی جگہ نگینہ کی طرح جڑے ہوئے ہیں- مدیر، مرتبین ومعاونین تحقیق وتفحص اور انتخاب کے سلسلہ میں صد مبارک باد کے مستحق ہیں- افسوس کہ ایسے معیاری رسالے میں پروف کی غلطیاں بہت کھٹکتی ہیں- □□□

دینی، ملی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں

لکھنؤ میں علامہ فضل حق خیر آبادی سمینار و کانفرنس

۲۵ اپریل ۲۰۱۱ء بروز اتوار سہکارتا بھون لکھنؤ میں قائد انقلاب ۱۸۵۷ء علامہ فضل حق خیر آبادی سمینار و کانفرنس کا انعقاد ہوا، پروگرام کا اہتمام باشتراک فکر و عمل دار العلوم وارثیہ لکھنؤ، مسلم کنونشن اتر پردیش، تنظیم ائمہ مساجد لکھنؤ اور تنظیم ابنائے اشرفیہ شاخ لکھنؤ نے کیا تھا، کنوینر دار العلوم وارثیہ لکھنؤ کے مہتمم مولانا محمد اقبال خان قادری تھے۔ پروگرام میں علمائے مدارس، ائمہ مساجد، دانشوران ملت اور خانقاہوں کے نمائندوں نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی، پروگرام کی صدارت مولانا یٰسں اختر مصباحی بانی و مہتمم دار القلم دہلی نے فرمائی، نظامت کے فرائض مولانا مبارک حسین مصباحی جنرل سکریٹری تنظیم ابنائے اشرفیہ مبارک پور نے انجام دیے۔

سمینار کے کنوینر مولانا اقبال احمد قادری نے اپنے تحریری ہدیۂ تشکر میں فرمایا۔ ''آپ حضرات کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تنظیم ابنائے اشرفیہ مبارک پور اور بہت سے علمائے کرام کی طرف سے ۲۰۱۱ کو علامہ فضل حق خیرابادی کی طرف منسوب کیے جانے کا ملک بھر میں اعلان ہو چکا ہے جس پر لبیک کہتے ہوئے ہم اور آپ اس باضابطہ سمینار و کانفرنس میں شریک ہو کر حضرت علامہ فضل حق خیرابادی کے وصال کے ڈیڑھ سو سال پورے ہونے پر انہیں خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔''

ناظم سمینار مولانا مبارک حسین مصباحی نے اپنے کلیدی خطبے میں علامہ فضل حق خیرابادی کی حیات و خدمات اور ان کے مجاہدانہ کردار پر بھرپور روشنی ڈالی، آپ نے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ''تنظیم ابنائے اشرفیہ مبارک پور اور علامہ یٰسں اختر مصباحی دہلی نے علامہ کے حوالے سے جو مہم چھیڑی ہے اب اس کے اثرات پورے ملک میں محسوس کیے جا رہے ہیں۔ ممبئی اور لکھنؤ میں دو کامیاب کانفرنسیں ہو چکی ہیں اور آج یہ عظیم سمینار ہو رہا ہے۔ اس کے بعد تنظیم ابنائے اشرفیہ ہوڑہ، مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد، جامعہ ملیہ دہلی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سیتاپور، کانپور، بھیونڈی اور دہلی میں بھی پروگرام ہونا طے ہو چکا ہے، ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور کا علامہ فضل حق خیرابادی نمبر ترتیب کے مراحل میں ہے جبکہ جام نور دہلی، ماہنامہ کنز الایمان دہلی، ماہنامہ ماہ نور دہلی بھی علامہ فضل حق خیرابادی کی شخصیت اور ان کی تحریک حریت پر گراں قدر خصوصی گوشے شائع کرنے کا عزم و اعلان کر چکے ہیں۔''

تنظیم ابنائے اشرفیہ مبارک پور کے نائب صدر مولانا یٰسں اختر مصباحی نے اپنے خطبہ صدارت میں علامہ فضل حق خیرابادی کے علمی اور انقلابی کارناموں پر بڑی مدلل گفتگو فرمائی، آپ نے فرمایا ''اودھ کے فرزند جلیل اور جنگ آزادی کے عظیم مجاہد کی بارگاہ میں ہمارا سب سے بڑا خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ان کی تصانیف اور ان پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کریں اور ان کے فکری اور اعتقادی نقش قدم پر چلیں، مولانا نے بطور خاص حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ وہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے علما اور مجاہدین کو تاریخ کی درسی کتابوں میں شامل کرے تاکہ بزرگوں سے متاثر ہو کر نئی نسل کے دلوں میں ملک و وطن سے محبت کا جذبہ پیدا ہو۔''

جامعہ اشرفیہ کے صدر المدرسین علامہ محمد احمد مصباحی نے ''علامہ فضل حق خیرابادی فلسفی یا عظیم متکلم'' کے موضوع پر گرانقدر مقالہ پیش کیا، جامعہ اشرفیہ کے صدر شعبہ افتا مفتی محمد نظام الدین رضوی نے ''علامہ فضل حق خیرابادی کی فقہی بصیرت'' پر انتہائی مدلل خطاب فرمایا، ہمدرد یونیورسٹی دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم نے ''جنگ آزادی میں علامہ فضل حق خیرآبادی کا کردار'' پر وقیع مقالہ پیش کیا، مولانا غلام عبد القادر علوی مہتمم دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف نے اپنے جذباتی خطاب میں حکومت اتر پردیش سے بار بار اپیل کی کہ جلد از جلد اودھ کے سپوت علامہ فضل حق خیرآبادی کے تعلق سے یادگاریں قائم کرے۔ مولانا ادریس بستوی نے علامہ کے مجاہدانہ کردار پر خطاب فرماتے ہوئے مسلمانوں سے پرزور اپیل کی کہ وہ اپنے اداروں کے نام علامہ کی طرف منسوب کریں اور ملک کے مختلف گوشوں

میں کانفرنسیں منعقد کرکے ان کے نام وکام کو زندہ کریں۔ مولانا نے حکومت اتر پردیش سے اپیل کی کہ وہ اودھ میں علامہ کے نام سے یونیورسٹی قائم کرے۔ سیمینار میں مفتی معراج القادری، مولانا مختار الحسن بغدادی، مولانا شہاب الدین بریلوی نے بھی خطاب فرمایا۔

سیمینار میں حضرت سید محمد اختر میاں سجادہ نشین آستانۂ صمدیہ پھپھوند شریف، سید شاہ سہیل میاں نائب سجادہ نشین بلگرام شریف، پیرزادہ راشد علی مینائی، شاہ مینا لکھنؤ، حضرت فرحت حسن میاں بھرگاہ حضرت نبی رضا شاہ لکھنؤ، جناب محمد انیس صاحب درگاہ لکھمن پیر لکھنؤ، حضرت قاری محمد احمد بقائی مہتمم دار العلوم حنفیہ لکھنؤ، مفتی شیر محمد مصباحی لکھنؤ، قاضی عالم رضا کانپور، مولانا فاروق مصباحی وغیرہ درجنوں علما، قرا اور ائمہ مساجد نے شرکت کی۔ سیمینار کے موقع پر تنظیم ابنائے اشرفیہ شاخ لکھنؤ نے علامہ کی حیات وخدمات پر مشتمل اردو اور ہندی میں پمفلٹ بھی تقسیم کیے۔ پروگرام کے آخر میں مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی گئیں جن کی سیمینار میں پرجوش تائید کی گئی۔

تجاویز ومطالبات:۔ علامہ فضل حق خیرآبادی سیمینار وکانفرنس منعقدہ ۲۴؍اپریل ۲۰۱۱ء بمقام سہکاریتا بھون لکھنؤ اتر پردیش نے باتفاقِ رائے ان تجاویز ومطالبات کو منظور کیا:

(۱) ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی اجمالی تاریخ اور ممتاز علما وقائدین انقلاب کی خدمات اور قربانیوں کو کالج ویونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں شامل کیا جائے۔

(۲) اودھ (اتر پردیش) کے کسی مناسب خطے اور علاقے میں ''علامہ فضل حق یونیورسٹی'' قائم کی جائے۔ (۳) دہلی لکھنؤ کے درمیان ایک سپر فاسٹ ٹرین بنام علامہ فضل حق چلائی جائے۔

مرکزی حکومت ہند اور صوبائی حکومت اتر پردیش سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں جلد از جلد متعلقہ اقدامات کرے۔

حضرت سید اختر میاں سجادہ نشین خانقاہ صمدیہ پھپھوند شریف کی دعا پر اجلاس ختم ہوا۔ آخر میں سامعین اور مہمانوں کو ماحضر پیش کیا گیا۔

رپورٹ:۔۔۔۔۔۔ محمد فاروق مصباحی، کنوینر تنظیم ابنائے اشرفیہ لکھنؤ

جمشید پور میں امام اعظم کانفرنس

مورخہ ۲۲؍اپریل ۲۰۱۱ء بروز جمعہ بعد نماز عشا دینی اصلاحی ورفاہی تحریک ''پیغام اسلام'' کے زیر اہتمام جگسلائی جمشید پور کی سر زمین پر پہلی بار مذہب حنفی کے بانی سراج الامت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں نیازمندانہ خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ''امام اعظم کانفرنس'' کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر اور اطراف کے علما وائمۂ مساجد اہل علم ودانش اور دین وملت کا درد رکھنے والے مسلمانوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی اور جذبۂ ایمانی کا شاندار مظاہرہ کیا۔ حافظ وقاری محمد مشتاق احمد کنوینر تحریک پیغام اسلام کی تلاوت قرآن سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ کولکاتا اور ممبئی سے آئے ہوئے مہمان نعت خواں سراج عطاری اور مولانا مزمل حسین اصدقی نے نعتیہ کلام اور منقبت کے اشعار پڑھے۔

''تقلید اور امام اعظم'' کے موضوع پر پہلا خطاب فاضل نوجوان مولانا سید سیف الدین اصدق چشتی، ڈائرکٹر ''پیغام اسلام'' کا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ ''امام اعظم کا دنیائے اسلام پر بڑا احسان ہے کہ ہزاروں فقہی مسائل کا قرآن وحدیث سے حل نکالا۔ ان کا تذکرہ جتنا ہونا چاہیے ہم نے نہیں کیا۔ ہم نے ان کی خدمات اور کارناموں کو کما حقہ اجاگر نہیں کیا۔ ائمہ اربعہ میں آپ ہی ایسے امام ہیں جو تابعی ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ وہ صرف فقیہ ہی نہیں بلکہ محدث بھی تھے۔'' انہوں نے کہا کہ ''تقلید قرآن وحدیث سے ثابت ہے، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور بزرگان دین نے تقلید کی۔'' مہمان خصوصی مفتی جلال الدین قادری ممبئی نے ''عقائد اہل سنت قرآن وحدیث کی روشنی میں'' کے عنوان پر مدلل خطاب فرمایا۔ کانفرنس کی صدارت مفتی صلاح الدین نظامی نے کی۔ اس کے انعقاد میں قاری مشتاق احمد اور تحریک کے ارکان نے اہم رول ادا کیا۔ اس موقع پر مشہور سماجی کارکن حاجی محمد ہدایت اللہ خان نے نعت پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ کتابوں کے دو اسٹال بھی لگائے گئے تھے جہاں امام اعظم کی حیات وخدمات پر کتابیں دستیاب تھیں۔ تحریک کی طرف سے ایک پمفلٹ بھی شائع کیا گیا تھا جس میں امام اعظم کی حیات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ شرکا میں مفتی ضیاء المصطفیٰ قادری، مولانا ہارون رشید، مولانا محمد حفیظ الدین مصباحی، مولانا مطیع اللہ ممبئی، قاری اسلم ربانی، مولانا امتیاز نعمانی، قاری شمشیر مصباحی، حافظ فہیم اختر، حافظ عبد الحمید قابلِ ذکر ہیں۔ تقریباً ۲؍بجے رات کو صلاۃ وسلام اور دعا پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

رپورٹ: محمد مبشر الاسلام، کنوینر تحریک پیغام اسلام جمشید پور جھارکھنڈ

Registered with the Registrar of Newspapers for India No. DELURD/2002/8231
DL(DG)-11/8049/09-11
MILLAT KA TARJAMAN JAAM-E-NOOR, Monthly
422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-110006
Vol.: 9 Issue: 103
June 2011

Date of Posting: 14th & 15th of Every Advance Month

Printed Published & Owned by Ghulam Rabbani, Printed at: Star Offset Printing Press, 2229/A, Ahata Hajjan Bi, Rodgaran, Lal Kuan, Delhi-6 & Published at 422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6
Editor: Khushtar Noorani